ایف اے
داخلہ جاری

اقتدار احمد ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام

ایف اے اور بی اے کی معیاری تعلیم کا جدید ادارہ

(رجسٹرڈ)

طوبیٰ گرلز کالج لاہور

- اسلامی تعلیمات اور نظریہ پاکستان کے فروغ پر خصوصی توجہ
- باپردہ اور پاکیزہ ماحول
- خوبصورت اور کشادہ عمارت
- ماڈرن کمپیوٹر لیب اور کمپیوٹر کی لازمی تعلیم بلا اضافی فیس
- طالبات کے لئے ٹرانسپوٹ (Pick & Drop) کی سہولت
- بیرون لاہور کی طالبات کے لیے ہوسٹل کی محدود سہولت

مزید معلومات کے لئے پراسپیکٹس حاصل کریں

طوبیٰ گرلز کالج 78 سیکٹر اے ون ٹاؤن شپ لاہور

فون 5114581 E-mail: toobacollege@ hotmail.com

DESIGN UNIT

ادارہ المطالعہ قرآن اکیڈمی
نمبر 3 12-8-2003
۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدّین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ مرحوم
مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے ایم فل پی ایچ ڈی
معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)
ادارۂ تحریر: حافظ خالد محمود خضر پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۲۲ | جمادی الاخریٰ ۱۴۲۴ھ - اگست ۲۰۰۳ء | شمارہ ۸

— یکے از مطبوعات —
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴- فون: ۵۸۶۹۵۰۱
کراچی آفس: داؤد منزل متصل شاہ بخاری شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۶۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون: 100 روپے، فی شمارہ: 10 روپے
☆ ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 700 روپے ☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 900 روپے

حرفِ اوّل

بسم اللہ الرحمن الرّحیم

ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس

قرآن اکیڈمی لاہور کے ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس میں تدریس کا آغاز یکم ستمبر سے ہو رہا ہے۔ اس کورس کا اجراء ۱۹۸۲ء میں قرآن اکیڈمی کی رفاقت سکیم سے منسلک حضرات کے لئے دو سالہ تعلیمی و تدریسی کورس کی حیثیت سے کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۴ء سے اس کورس کو عمومی حیثیت دے دی گئی اور مرکزی انجمن خدام القرآن کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ نے جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو دعوت دی کہ وہ اپنی حیاتِ مستعار کے پندرہ بیس سال مروّجہ دنیوی علوم کی تحصیل میں صرف کرنے کے بعد دو سال عربی زبان کو پختہ بنیادوں پر سیکھنے اور قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی جیسے علوم کی تحصیل کے لئے وقف کریں۔ الحمد للہ کہ اس مردِ درویش کی پکار کو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے پذیرائی حاصل ہوئی اور کراچی سے پشاور تک سے پچاس کے قریب احباب اس کورس میں شرکت کے لئے چلے آئے' جن میں اکثریت ڈاکٹرز' انجینئرز اور پوسٹ گریجویٹ حضرات کی تھی۔ شرکائے کورس کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ کئی تشنگانِ علم لاہور کی دور دراز بستیوں سے روزانہ سفر کر کے کلاس میں شریک ہوتے۔ تدریس کی ذمہ داری جن فاضل اساتذہ کرام نے نبھائی ان میں نمایاں ترین نام حافظ احمد یار صاحب علیہ الرحمۃ کا ہے۔ حافظ صاحب مرحوم و مغفور نے پہلے عربی گرامر (صرف و نحو) کی پختہ بنیادوں پر تدریس فرمائی' اس کے بعد اس گرامر کا اطلاق کرتے ہوئے پورا قرآن حکیم بطور ٹیکسٹ پڑھایا' جو تعلیم و تعلّم قرآن کے میدان میں ایک انقلابی قدم تھا۔ یہ دو سالہ تعلیمی و تدریسی کورس تین گروپوں نے کامیابی سے مکمل کیا جس میں جدید تعلیم یافتہ حضرات نے پورے قرآن حکیم کے قواعد کے اجراء کے ساتھ ترجمہ' مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب تفصیلی وضاحت کے ساتھ اور احادیث نبویؐ کا مجموعہ مشکوٰۃ المصابیح پڑھنے کے ساتھ ساتھ اصولِ حدیث' فقہ اور اصولِ فقہ کی بنیادی معلومات کی تحصیل بھی کی۔ کچھ عرصے کے بعد محسوس ہوا کہ اس کورس میں شرکت کے خواہش مند بہت سے حضرات کے لئے دو سال کا وقت نکالنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے' لہٰذا نصاب کو مختصر کر کے کورس کا دورانیہ ایک سال کر دیا گیا' جو الحمد للہ کئی سال سے کامیابی سے جاری ہے اور ہر سال بیسیوں اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات و خواتین اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ آج کل اس کورس میں داخلہ جاری ہے اور یہ طالبانِ علم قرآن کے لئے اپنی پیاس بجھانے کا سنہری موقع ہے۔ کورس کا اشتہار زیرِ نظر شمارہ کے اندرونی بیک ٹائٹل پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے اور تفصیلی معلومات کے لئے پراسپکٹس حاصل کیا جا سکتا ہے۔ oo

درس ۲۶

اُمّتِ مُسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت
اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید
(۵)

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم ..... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾

اِلٰی قولہٖ تعالٰی : ﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝﴾..... صدق اللّٰہ العظیم

''وہی اوّل ہے' وہی آخر ہے' وہی ظاہر ہے' وہی باطن ہے' اور وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے''..... ''وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔ اور جو کام تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

اسماءِ باری تعالیٰ کے درمیان حرفِ عطف کا مسئلہ

میں اگرچہ اپنے طور پر تو فیصلہ کر چکا تھا کہ سورۃ الحدید کے حصہ اوّل پر' جو چھ آیات پر مشتمل ہے' ہماری گفتگو اب مکمل ہو گئی ہے اور اب ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ لیکن گزشتہ درس کے بارے میں مجھ سے ایک استفسار کیا گیا ہے جس سے نشان دہی ہوئی ہے کہ میری گفتگو میں ایک خلا رہ گیا ہے جسے پُر ہونا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ وحدت الوجود کے ضمن میں اب تک ہونے والی گفتگو کے بارے میں مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ شاید میرا ذاتی موقف پورے طور پر واضح نہیں ہو سکا اور عین ممکن ہے کہ زندگی میں

آخری مرتبہ ان آیات پر گفتگو ہو رہی ہو' لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ وحدت الوجود کے بارے میں اپنا ذاتی موقف بھی پوری طرح وضاحت سے بیان کر دوں' مبادا کوئی مغالطہ باقی رہے اور غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ جن حضرات پر یہ بحث کچھ گراں گزر رہی ہو اُن سے میں معذرت خواہ ہوں۔ متذکرہ بالا دو اسباب کی بناء پر ہمیں ابھی اپنے سابقہ موضوع کو جاری رکھنا ہے۔

میں نے یہ کہا تھا کہ قرآن مجید میں صرف یہ ایک مقام ہے ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ جہاں اللہ تعالیٰ کے اسماء کے مابین حرف عطف آیا ہے۔ اور نحو کا قاعدہ یہ ہے کہ معطوف اور معطوف الیہ میں مغائرت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں اسی سلسلۂ سُوَر میں سورۃ الحشر کے آخر میں جو آیت مبارکہ وارد ہوئی ہے وہاں تسلسل کے ساتھ اللہ کے آٹھ اسماء آئے ہیں' لیکن ان کے درمیان کہیں کوئی حرف عطف نہیں ہے ﴿اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ﴾ جبکہ یہ واحد مقام ہے جہاں حرف عطف آیا ہے۔ اس ضمن میں مجھ سے سوال کیا گیا ہے کہ اس مقام پر اسماء باری تعالیٰ کے درمیان حرفِ عطف کیوں آیا ہے؟ چنانچہ اس ضمن میں وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا' اوّل' آخر' ظاہر اور باطن یہ چاروں اسماء ایسے ہیں جو کسی نسبت اضافی کا تقاضا کرتے ہیں۔ جیسے اَوَّلُهٗ' آخِرُهٗ' ظَاهِرُهٗ' بَاطِنُهٗ۔ میں نے مثال دی تھی کہ حضور ﷺ نے شعبان کے آخری دن ایک خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس میں رمضان المبارک کی عظمت کا بیان ہے۔ اس کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے: ((اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ وَآخِرُهٗ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ)) ''اس (ماہِ مبارک) کا پہلا حصہ (عشرہ) رحمت ہے' دوسرا حصہ مغفرت ہے اور آخری (عشرہ) آگ سے نجات ہے''۔ اسی طرح ظاہر و باطن کے لئے اسی سورۃ کے دوسرے رکوع میں الفاظ آئے ہیں: ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾ یہاں باطن کی اضافت بھی ''ہٗ'' کی طرف ہے اور ظاہر کی اضافت بھی ''ہٗ'' کی طرف ہے۔ تو درحقیقت زیرِ نظر

آیت میں مراد یہ ہے کہ اس سلسلۂ کون و مکان' اس سلسلۂ تخلیق کا اوّل بھی اللہ ہے' آخر بھی اللہ ہے' اس کا ظاہر بھی اللہ ہے اور باطن بھی اللہ ہے۔

یہاں یہ بات سمجھ میں آ جانی چاہئے کہ اوّل و آخر میں تو لازماً مغائرت ہوگی۔ اگر درمیان میں کوئی فصل ہے' کوئی زمانی بُعد ہے تو اَوَّلُہٗ وَاٰخِرُہٗ ایک وقت میں نہیں ہو سکتے۔ خود ان الفاظ کا تقاضا ہے کہ ان میں لازماً مغائرت ہونی چاہئے۔ یوں سمجھئے کہ ایک وقت تھا کہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ تھی' کائنات نہیں تھی۔ پھر کائنات کو وجود بخشا گیا تو اس کا اوّل اللہ ہے' جہاں سے یہ کائنات شروع ہو رہی ہے۔ اس کے بعد پھر ایک وقت آئے گا کہ صرف اللہ کی ذات ہوگی' کائنات نہیں ہوگی۔ گویا کہ یہ اس کا آخر ہے۔ چنانچہ اس کائنات کا اوّل و آخر ذاتِ باری تعالیٰ ہے' درمیان میں یہ کائنات ہے۔ اور اس کائنات میں ظاہر و باطن کی dimensions پیدا ہوئیں تاکہ احاطہ ہو جائے کہ وہی وہ ہے۔ ظاہر و باطن تو یقیناً بیک وقت (simultaneous) ہیں' ان میں مغائرت نہیں ہو سکتی۔ کسی شے کا ظاہر و باطن تو ساتھ ہی ہوں گے۔ پہلے دو اسماء مغائرت اور فصل کے متقاضی ہیں اس لئے ان کے درمیان حرفِ عطف آ گیا' اسی مناسبت سے پھر پوری آیت کے اندر حرفِ عطف لایا گیا۔ اس سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ درحقیقت اس آیۂ مبارکہ کا موضوع حقیقت وجود ہے۔

''وحدت الوجود'' کے بارے میں میرا موقف

اب آیئے اس بات کی طرف کہ وحدت الوجود کے بارے میں میرا کیا موقف ہے۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سن ۵۶-۱۹۵۵ء میں' جبکہ میری عمر تینتیس' چونتیس برس تھی' میں اس مسئلے پر اپنا غور و فکر مکمل کر کے ایک حتمی رائے تک پہنچ چکا تھا' اور وہ حتمی رائے اُس وقت میرے ذہن میں کس انداز سے آئی تھی' اسے میں بیان کر رہا ہوں۔ جہاں تک ہمارے دین کی عملی حیثیت کا تعلق ہے اسے ہم شریعت اور طریقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ شریعت اس دین کے عمل کا ظاہری پہلو ہے اور طریقت اسی کا باطنی پہلو ہے۔ شریعت (فقہ) بحث کرے گی کہ نماز کے ارکان کیا ہیں' اوقات کیا

ہیں' مختلف نمازوں کی رکعتیں کتنی ہیں' ہر رکعت میں ارکان کیا ہیں اور ان کی ترتیب کیا ہے' وغیرہ' جبکہ اسی نماز کا جو ایک باطنی پہلو مطلوب ہے کہ خشوع وخضوع ہو' حضورِ قلب ہو' انسان ہمہ تن متوجّہ ہو' اپنی پوری شخصیت کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا ہوا کھڑا ہو' رکوع یا سجدہ میں ہے تو بھی پوری شخصیت جھک گئی ہو' یہ طریقت کا موضوع ہے۔ تو یہ جو دین کے عملی پہلو ہیں شریعت اور طریقت (یا ظاہر و باطن) ان دونوں کا تعلق یا ''ہمہ از اوست'' سے ہے یا ''ہمہ با اوست'' سے ہے۔ یعنی ان دونوں پہلوؤں کا تعلق یا تو اس سے ہے کہ سب کائنات اللہ کی ذات سے ہے' یا یہ کہ یہ سب سلسلۂ کون و مکان اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ ''ہمہ از اوست'' اور ''ہمہ با اوست'' کے مابین جو فرق ہے وہ میں بعد میں بیان کروں گا۔ ان کو اس درجہ میں سمجھ لیجئے کہ شریعت کا اوّلین درجہ ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یعنی لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ ۔ یہاں معبود کو اس کے جامع مفہوم میں لیجئے کہ مطاعِ مطلق اللہ ہے' حاکم اللہ ہے' اسی کا حکم ماننا ہے اور درحقیقت رسول کا حکم بھی اسی کا حکم ہے' اُس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرنی ہے' اس کے بتائے ہوئے حلال و حرام پر قائم رہنا ہے' اُسی سے ڈرنا ہے' اُسی سے سوال کرنا ہے' اُمید اُسی سے رکھنی ہے۔ پھر یہ کہ رازق وہی ہے۔ اسی طرح حاجت روا و مشکل کشا وہی ہے۔ یہ دین کا بالکل بنیادی تصور ہے۔ تو گویا پہلا قدم ''لا معبودَ الّا اللّٰہ'' ہے۔

اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ' لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ' لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ ۔ یعنی انسان کی زندگی میں مقصود و مطلوب کی حیثیت صرف اللہ کو حاصل ہو جائے' اس کا نصب العین صرف اللہ کی ذات ہو' محبوبِ حقیقی صرف اللہ ہو' باقی ساری محبتیں اس کی محبت کے تابع ہو گئی ہوں۔ یہ طریقت کی آخری منزل ہے۔ یہ وہ باطنی کیفیت ہے جو مطلوب ہے ﴿اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا﴾ کے مصداق انسان یکسو ہو کر اللہ کی ذات کی طرف متوجہ ہو گیا ہو' وہی اس کا مطلوب و مقصود اور وہی اس کا محبوبِ حقیقی بن گیا ہو۔ ان دونوں کا تعلق یا ہمہ از اوست سے ہے یا ہمہ با اوست سے۔ لیکن جو حقیقت ہے وہ ہمہ اوست کی وہ تعبیر ہے

جو شیخ ابن عربی نے کی ہے' یعنی وحدت الوجود۔ ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے درمیان ایک باریک فرق ہے جو اگر ملحوظ نہ رہے تو بڑا خطرہ ہے ع ہوشدار کہ رہبر دمِ تیغ است قدم را! ذرا سی اگر بے احتیاطی ہو جائے تو انسان کفر اور شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ راستہ بہت خطرناک ہے۔ اور ویسے بھی اوّل تو اس حد تک رسائی بہت کم لوگوں کی ہوتی ہے' پھر اگر کوئی پہنچ بھی جائے تو اسے یہ احساس ہضم کرنا بہت مشکل ہے۔ مجھے سلطان باہو کا وہ مصرع یاد آ رہا ہے کہ ع جان پُھلن تے آئی ہو! واقعہ یہ ہے کہ جب انسان کو وحدت الوجود کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے اندر ایک ایسی کیفیت محسوس کرتا ہے کہ اس کو ضبط میں لے آنا اور اپنی شخصیت کو اپنے مقام پر برقرار رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ پھر یا تو وہ ہوگا جو منصور الحلّاج اور سرمد کے ساتھ ہوا تھا' کہ انہوں نے ''انا الحق'' کا نعرہ لگا دیا' یا ایک اور بڑی پیاری کیفیت ہے جس کا شیخ سعدی نے بڑے خوبصورت الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ ع

آن را کہ خبر شد خبرش بعد نیامد!

کہ ''جو شخص یہاں تک پہنچ گیا پھر اس کی خبر نہیں ملتی۔'' یعنی پھر وہ خاموش ہو جائے گا' کیونکہ زبان کھولنے میں خطرہ ہے' اندیشہ ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ جب یہ چیزیں کچھ شعراء کے ذریعے سے' خاص طور پر حافظ کے ذریعے سے' عوام الناس میں آ گئیں تو اس سے بڑے خطرناک نتائج برآمد ہوئے اور دین و شریعت کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی۔ پھر ''مسجد مندر جھگڑو نور'' کا فلسفہ پیش کیا گیا اور وحدتِ ادیان کا باطل نظریہ وجود میں آیا۔ اسی فتنہ کے سدباب کے لئے اور اس کا رُخ موڑنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے شیخ احمد سرہندیؒ کو کھڑا کیا' جن کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!

اُس وقت برعظیم پاک و ہند میں ملّتِ اسلامیہ اور اُمّتِ محمدؐ کا تشخص ختم ہو رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ درحقیقت ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے مابین باریک فرق کو ملحوظ

نہ رکھنے کے باعث اور ان کا عوام کی سطح پر اشعار کے ذریعے سے آ جانے کے باعث ہوا' جس کے خلاف شیخ احمد سرہندی نے علمِ جہاد بلند کیا۔ یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے ساتھ علامہ اقبال کو بہت سے اعتبارات سے خصوصی نسبت حاصل ہے۔ علامہ اقبال نے بھی برعظیم میں مسلم قومیت کے تشخص کو واضح کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ان کا فکر و فلسفہ اور ان کی عظیم شخصیت نہ ہوتی تو بیسویں صدی کے آغاز میں وحدتِ ادیان کا جو فلسفہ گاندھی کے ذریعہ بہت شد و مد کے ساتھ آیا تھا اس کے آگے بند باندھنا ممکن نہ رہتا۔ اور تو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی نابغہ شخصیت بھی اس رو میں بہہ گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس برعظیم پاک و ہند میں اُس وقت پھر وہی صورت حال پیدا ہو رہی تھی جو تین سو برس پہلے ہوئی تھی کہ جب ''دینِ الٰہی'' کی شکل میں ایک نیا دین گھڑ لیا گیا تھا اور دین محمدیؐ کے خاتمہ کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس بار اس فتنے کا مقابلہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبال کو اٹھایا۔ آپ ایک مفکر اور فلسفی تھے' ان کی بات میں وزن تھا' ان کا انداز لوگوں کے دل کو بھانے والا تھا۔ پھر وہی شخص تھا جو پنڈت نہرو سے بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا۔ ختم نبوت پر ان کی نہرو کے ساتھ بڑی مدلل و مفصل خط و کتابت ہوئی۔ ظاہر ہے کوئی عالم دین تو پنڈت نہرو کے ساتھ بحث و تکرار نہیں کر سکتا تھا۔ علماء کرام ختمِ نبوت پر قرآن و حدیث سے تو دلائل دے سکتے تھے' لیکن اس کی فلسفیانہ بحث علامہ اقبال کے سوا کسی نے نہیں کی۔ علامہ اقبال شروع میں حافظ کے شدید دشمن رہے اور اس فلسفے کی انہوں نے بڑی شدّت کے ساتھ نفی کی۔

''سورج مکھی کے پھول بن جاؤ!''

جیسا کہ میں نے عرض کیا' اُس زمانے (۵۶-۱۹۵۵ء) میں مَیں اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ طریقت اور شریعت دونوں کا تعلق ''ہمہ از اوست'' یا ''ہمہ با اوست'' سے ہے' جب کہ حقیقت ''وحدت الوجود'' ہے جو ''ہمہ اوست'' ہی کی ایک محتاط تعبیر ہے۔ اُس زمانے میں ایک تشبیہ یا تمثیل بھی میرے ذہن میں آئی تھی کہ ''سورج مکھی کے

پھول بن جاؤ!'' اس کی میں وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے کیا مراد ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سائنس کے نظریات میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اُس وقت یہ خیال بہت غالب تھا کہ ہماری یہ زمین درحقیقت سورج کا ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا ہے اور دوسرے سیارے جو سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں وہ بھی سورج ہی کے ٹکڑے ہیں۔ چنانچہ جس طرح سورج اپنے محور کے گرد حرکت کر رہا ہے اسی momentum کا نتیجہ ہے کہ اس سے ٹوٹنے والے ٹکڑے بھی اس کے گرد چکر لگانے لگے۔ تو گویا یوں سمجھئے کہ ابتدا میں ہماری زمین بھی آگ کا ایک بہت بڑا کرہ تھی' پھر یہ ٹھنڈا ہونا شروع ہوئی۔ اس کے ٹھنڈا ہونے کے دو نتیجے نکلے۔ ایک یہ کہ اس سے بخارات نکلے جو اوپر گئے تو انہوں نے فضا (کُرۂ ہوائی) کی صورت اختیار کی۔ دوسرے یہ کہ ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے خود زمین سکڑ گئی' جس کے نتیجے میں اس کی سطح پر کہیں بلندیاں پیدا ہو گئیں اور کہیں گہرے غار وجود میں آ گئے۔ فضا کا غلاف ہماری زمین کے گرد تیس پینتیس میل ہے۔ فضا میں جمع ہونے والی گیسوں کے نتیجہ میں بارش ہوئی اور نہ معلوم کتنے عرصہ تک بارش ہی ہوتی رہی' جس سے نشیبی علاقوں میں پانی جمع ہو گیا اور اس طرح سمندر وجود میں آئے۔ جو علاقے اونچے تھے وہ خشکی قرار پائے۔ پھر جہاں یہ برّ و بحر آپس میں جڑے ہوئے تھے وہاں دلدلی علاقوں میں حیاتِ ارضی کا آغاز ہوا۔ یہ حیاتِ ارضی دو طرح کی تھی: ۱۔ حیاتِ نباتاتی (Plant Kingdom) ۲۔ حیاتِ حیوانی (Animal Kingdom)۔

حقیقت کے اعتبار سے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس زمین پر جو بھی ہے وہ سورج ہی سے ہے (ہمہ از اوست) یہ سب سورج ہی کا ظہور ہے۔ زمین بھی سورج ہی کا ٹکڑا تھی جو ٹھنڈا ہوا' پھر اسی میں سے gases نکلی تھیں' خارج سے تو کوئی شے نہیں آئی۔ ہوا بھی وہیں سے ہے' خشکی بھی وہی سے ہے اور سمندر بھی وہیں سے ہے۔ پھر وہیں کے امتزاج (interaction) سے اس دلدلی علاقے میں حیاتِ نباتاتی اور حیاتِ حیوانی کا آغاز ہوا۔ گویا زمین پر جو کچھ ہے اس کا ماخذ (origion) سورج ہے۔ گویا یہ تو ہوئی

حقیقت۔ اصل طریقت اور شریعت کیا ہے؟ وہ سورج مکھی کے پھول کا طرزِ عمل ہے۔ جیسے ہی سورج طلوع ہوتا ہے وہ اپنا رخ سورج کی طرف کر لیتا ہے' جیسے جیسے سورج گردش کرتا ہے اس کا رخ بدلتا جاتا ہے' جب سورج غروب ہوتا ہے تو پھول بھی مرجھا جاتا ہے۔ اگلی صبح جب سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ پھر تروتازہ ہو جاتا ہے۔ گویا کہ سورج مکھی کے پھول نے اپنے وجود کا مقصد اور اپنا نصب العین یہ مقرر کیا کہ وہ اپنے اصل مبدأ کی طرف اپنی توجہ مرکوز رکھے۔ یہی طرزِ عمل ایک بندۂ مؤمن سے مطلوب ہے: ﴿اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ﴾ بجائے اس کے کہ سورج مکھی کا پھول اس سوچ بچار میں غلطاں و پیچاں رہے کہ میں کہاں سے آیا ہوں' سورج کا ٹکڑا ہوں' میری زمینی حیات کا آغاز کیسے ہوا' کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اپنا رخ سورج کی طرف رکھو۔ اسی طرح ہمیں اس فکر میں غلطاں و پیچاں ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم کہاں سے وجود میں آئے ہیں اور کیسے وجود میں آئے ہیں' ہمارے وجود اور ہماری زندگی کا مقصد صرف یہ ہونا چاہئے کہ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾ اور ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ سورج مکھی کے پھول کی طرح ہمارے دل کی کلی کھلے تو اس سے کہہ ہم اللہ کو یاد کر رہے ہیں' اللہ کے حضور میں حاضر ہیں۔ اور اگر کہیں بھی بندۂ مؤمن محسوس کرے کہ غیاب ہو گیا ہے' حضوری نہیں رہی' کوئی بُعد ہو گیا ہے' میری توجہ کسی اور طرف مبذول ہو گئی ہے' میں کچھ غافل ہو گیا ہوں تو فوراً اس پر پچھتاوے کی کیفیت طاری ہو اور وہ پھر اپنا رخ اسی کی طرف کر لے' جیسے سورج مکھی کا معاملہ ہے کہ سورج طلوع ہوتے ہی وہ کھل اٹھتا ہے اور پورا دن جدھر سورج جاتا ہے ادھر ہی وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے' اور جب سورج غروب ہوتا ہے تو وہ بھی بجھ کر رہ جاتا ہے۔ یہ ہے اصل میں حقیقت' طریقت اور شریعت۔ حقیقت تو یہی ہے کہ سورج مکھی بھی سورج سے نکلی ہوئی ایک شے ہے' لیکن ہماری توجہ اصلاً طریقت اور شریعت پر مرکوز ہونی چاہئے۔

وحدت الوجود، مجدّد الفِ ثانی اور علّامہ اقبال

آج میں یہ بھی عرض کر دوں کہ لاہور منتقل ہونے کے بعد ۶۵ء سے ۷۱ء تک قریباً چھ سال مجھے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا بڑا وافر اور مسلسل موقع ملا ہے۔ میرا کلینک کرشن نگر میں تھا جو اَب اسلام پورہ کہلاتا ہے۔ چشتی صاحب روزانہ شام کو میرے پاس آ جاتے تھے اور ان سے میرا تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ اس طرح میں نے دس بارہ سال قبل جو پختہ رائے قائم کر لی تھی، اس میں مجھے نہ صرف پختگی حاصل ہوئی بلکہ اس خاکے میں رنگ بھر آگیا۔ اس ضمن میں مَیں ان کا احسان مند ہوں۔ اُس وقت تک میں نے نہ تو شیخ احمد سرہندی کی مکتوبات کا مطالعہ کیا تھا نہ علامہ اقبال کے فارسی کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا، لہٰذا یہ حقیقت مجھے درحقیقت ان کے ذریعے ہی معلوم ہوئی کہ شیخ احمد سرہندیؒ بھی اپنی زندگی کے آخری دَور میں وحدت الوجود کے قائل ہو گئے تھے۔ اس پر انہوں نے کلامِ اقبال کی شروحات میں بڑی مفصل تحریریں لکھی ہیں اور یہ بات ثابت کی ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال نے بھی زندگی کے آخری دَور میں ''لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ'' کا نعرہ بڑے بلند آہنگ کے ساتھ بلند کیا تھا۔ ان کی ایک رباعی ملاحظہ کیجئے جو علامہ نے اپنی وفات سے کل تین ماہ قبل کہی تھی ؎

تو اے ناداں دلِ آگاہ دریاب
بخود مثلِ نیاگاں راہ دریاب
چساں مؤمن کند پوشیدہ را فاش
ز لا موجودَ اِلّا اللہ در یاب!

''اے غافل! تو ایسا دل حاصل کر جو آگاہ ہو۔ جیسے تمہارے بزرگ خود راستہ تلاش کرتے رہے ہیں (اور غور و فکر کے ذریعے سے حقیقت تک پہنچتے رہے ہیں) اسی طرح تم بھی کوشش کرو (یعنی محض تقلید کی روش اختیار نہ کرو بلکہ تحقیق کا راستہ اختیار کرو۔) جس طرح مؤمن پوشیدہ کو رفتہ رفتہ فاش کرتا ہے تم ''لا موجود الا اللہ'' سے حقیقت تک رسائی حاصل کرو۔''

یہ گویا فکرِ انسانی کی آخری منزل ہے۔ تو حضرت مجدد الف ثانیؒ بھی وہیں پہنچے

تھے اور علامہ اقبال بھی بالآخر وہیں پہنچے۔ بلکہ علامہ اقبال کے بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ تصوف اور ہمہ اوست کا عامیانہ تصور بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ لیکن میں اس وقت اس طرف نہیں جانا چاہتا کہ ان کی کیا تاویل کی جائے گی۔ میں نے اِس وقت صرف یہ بتایا ہے کہ سن ۵۶۔۱۹۵۵ء میں میری جو رائے قائم ہو چکی تھی اس کے بعد سن ۶۵ء سے ۷۱ء تک کے عرصہ میں اس میں پختگی پیدا ہوئی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ذرا اس کی وضاحت کر دوں۔ جہاں تک ''ہمہ از اوست'' کا تعلق ہے یہ تمام مسلمان اہل سنت، متکلمین، ائمہ اور علماء دین کے نزدیک متفق علیہ بات ہے۔ یہ توحید کا کم سے کم تقاضا ہے کہ جو کچھ ہے اللہ سے ہے (ہمہ از اوست) یعنی وہ خود بخود وجود میں نہیں آیا، بلکہ اللہ کا تخلیق کردہ ہے۔ جسے سورۃ الطور آیت ۳۵ میں فرمایا گیا: ﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ ۞﴾ ''کیا یہ خود بخود بن گئے (کسی کے بنائے بغیر) یا یہ خود اپنے آپ کو بنانے والے ہیں؟'' ظاہر بات ہے کہ بنانے والا اللہ ہے۔ نہ از خود کوئی بنا ہے اور نہ یہ اپنے آپ کو بنانے والے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ مضمون دو مقامات پر آیا ہے۔ سورۂ لقمان کی آیت ۱۱ میں یہ مضمون بایں الفاظ آیا ہے:

﴿هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَا ذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ﴾

''یہ سب اللہ کی تخلیق ہے، ذرا بتاؤ کہ اس کے سوا بھی کسی نے کچھ بنایا ہے؟''

''ہمہ از اوست'' تو عقیدۂ توحید کی مبادیات میں سے ہے جس میں کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ''ہمہ با اوست'' کیا ہے؟ یہ اصل میں وہ نظریہ ہے جو فلسفۂ وجود کی پہلی منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔

ہمارے اسلاف میں ایک تو علاؤ الدین صدانیؒ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش (enunciate) کیا اور پھر یہ زیادہ مشہور مجدد الف ثانیؒ کے نظریہ وحدت الشہود کے نام سے ہوا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کائنات اور خالق دونوں کا وجود اپنی اپنی جگہ پر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ دونوں کا ساتھ ساتھ تو ثنویت ہے، پھر تو (خالق اور مخلوق) دو وجود ہو گئے! چنانچہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے ڈاکٹریٹ کا جو تھیسز لکھا

تھا: "Mujaddids Concept of Toaheed" وہ مجھے بہت پسند ہے۔ اکثر لوگوں کی نظروں سے حضرت مجددؒ کا آخری موقف اوجھل ہے' لیکن عام طور پر جو چیز ان کی طرف منسوب ہوتی ہے وہ یہی ثنویت (Dualism) ہے' توحید وجودی نہیں ہے۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اسے واضح طور پر تسلیم کیا ہے۔ ایک دیانت دارانہ تحقیق کا تقاضا یہی ہے کہ اس کا جو بھی نتیجہ نکل رہا ہے آدمی اسے بیان کرے۔ بہرحال یہ ثنویت ہے اور ایک اعتبار سے اسے شرک فی الوجود کہا گیا ہے۔

''ہمہ اوست'' اور اس کی مختلف تعبیرات

غالبؔ کا ایک شعر ہے۔

جاروبِ لا بیا کہ ایں شرک فی الوجود
با درجہ فرش و سینہ بایواں برابر است

یعنی ہمارا سینہ ایک ایوان کی مانند ہے اور یہ شرک فی الوجود (کہ وجود ہمارا بھی ہے اور اللہ کا بھی) اُس گرد کی مانند ہے جو اس ایوان پر آ گیا ہے۔ چنانچہ ''لا'' کی جھاڑ لاؤ اور اس سے اسے صاف کر دو۔ شرک فی الوجود کا خاتمہ توحید وجودی سے ہوتا ہے' جس کی ایک تعبیر ''ہمہ اوست'' ہے۔ دنیا بھر میں جو چوٹی کے نظریاتی (idealist) فلسفی ہیں وہ اسی کے قائل ہیں۔ ان کا نقطۂ آغاز افلاطون ہے۔ حکیم فلاطینوس کا تعلق سکندریہ (مصر) سے تھا جس کے نظریات ہمارے مسلمانوں کے تصوف میں سرایت کر گئے۔ اسی طرح ابن عربی اندلس سے متعلق تھے۔ اس ضمن میں دو بڑی شخصیتیں برعظیم میں مشہور ہوئیں۔ ایک ہندوؤں میں شنکراچاریہ اور دوسرے اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں مرزا عبدالقادر بیدل' جو فارسی کے عظیم شعراء میں سے ہیں۔ یہ چار چوٹی کے لوگ ہیں جنہوں نے اس نظریئے کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ البتہ اس کے جو تین shades ہیں اور اس اعتبار سے اس کی جو تین تعبیرات ہیں انہیں علیحدہ علیحدہ identify کر لیجئے۔ اسی حوالے سے میں نے کہا تھا کہ ع

ہوشدار کہ رہبر دم تیغ است قدم را!

اس فرق کو اگر ملحوظ نہیں رکھیں گے تو شرک و کفر ہو جائے گا۔

ہمہ اوست کی ایک تعبیر Pantheism ہے۔ یعنی جب وجود ایک ہی ہے تو یہ کائنات گویا خدا کا حصہ ہے یا ہمہ تن خدا ہے' خود خالق ہی نے مخلوق کی شکل اختیار کر لی' جیسے برف پگھل کر پانی بن گئی اور پانی کو آپ نے ابالا تو وہ بھاپ بن گیا۔ اب پانی ہی برف بھی ہے اور بھاپ بھی ہے۔ اس نظریئے میں کائنات کو حقیقی مانا گیا ہے کہ یہ درحقیقت واقعی ہے اور یہ خالق کا حصہ ہے یا خالق ہی ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ عظیم ترین کفر و شرک ہے اور اس کا اسلام کے ساتھ یا حقیقت کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔

دوسری تعبیر وہ ہے جو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنی زندگی کے آخری دَور میں اختیار کی کہ حقیقت میں وجود ایک ہی ہے جو اللہ کا ہے' جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ درحقیقت ہے ہی نہیں۔ اس کی مثال میں دے چکا ہوں کہ آپ ایک مشعل کو دائرے کی صورت میں حرکت دیں تو ایک آتشیں دائرہ نظر آئے گا جو حقیقت میں موجود نہیں ہے۔ یہ دراصل اس کائنات کی نفی ہے کہ اس کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ چنانچہ وجود صرف ایک ذاتِ باری تعالیٰ کا رہ گیا' جس سے شرک اور ثنویت کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی کو غالبؔ نے یوں بیان کیا ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

اور عربی شعر میں آپ کو پہلے بھی سنا چکا ہوں ؎

کل ما فی الکون وَھمٌ او خیال
او عُکوس فی المَرایا او ظلال

یعنی کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ محض وہم یا خیال ہے' یہ یا تو محض آئینوں میں نظر آنے والے عکس ہیں یا سائے ہیں۔ حقیقت میں تو صرف ذاتِ باری تعالیٰ کا وجود ہے اور کوئی شے حقیقتاً موجود نہیں ہے ع

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!

لیکن یہ بات کہ کائنات کا وجود ہے ہی نہیں، قابل قبول نظر نہیں آتی۔ یہ ایک شاعرانہ خیال یا فلسفیانہ توجیہہ تو ہوسکتی ہے، لیکن کائنات تو بڑی ٹھوس حقیقت ہے۔ آپ نے شرک فی الوجود کی نفی کرنے کے لئے کائنات ہی کی نفی کر دی؟

میرے نزدیک اس کا اصل حل وہ ہے جو شیخ ابن عربیؒ نے دیا ہے، جو میں بیان کر چکا ہوں، کہ حقیقت و ماہیت وجود کے اعتبار سے خالق و مخلوق کا وجود ایک ہے، کائنات میں وہی وجودِ بسیط سرایت کئے ہوئے ہے، لیکن جہاں تعین ہو گیا تو وہ پھر غیر ہے، اُس کا عین نہیں۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ یہ کائنات کا وجود ایک اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا عین اور دوسرے اعتبار سے اس کا غیر ہے۔ یہ ابن عربی کا فلسفہ ہے۔ اور ابن عربی ہمارے دینی حلقوں کی سب سے زیادہ متنازعہ فیہ (controvercial) شخصیت ہیں۔ ان کی حمایت اور مخالفت دونوں انتہا کو پہنچی ہیں۔ ہمارے صوفیاء کی عظیم اکثریت انہیں شیخ اکبر کے نام سے جانتی ہے۔ ان کی کتابیں ''فصوص الحِکَم'' اور ''فتوحاتِ مکّیہ'' تصوف کی بہت اہم کتابیں ہیں۔ دوسری طرف اختلاف بھی اتنا شدید ہے کہ امام ابن تیمیہؒ نے ان کو ملحد و زندیق قرار دیا ہے اور جو بھی شرعی گالی ہو سکتی تھی ان کو دی ہے۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اگر شیخ اکبر کی کسی بات کی تائید کر رہا ہوں تو وہ ان کا صرف یہ نظریہ ہے، باقی میں نے نہ فصوص الحِکَم کا مطالعہ کیا ہے، نہ فتوحاتِ مکیہ کا۔ یہ بڑی دقیق کتابیں ہیں اور آدمی جب تک قدیم فلسفہ و منطق میں مہارتِ تامہ بہم نہ پہنچالے اس کے لئے ان کتابوں کا پڑھنا آسان کام نہیں ہے۔ ویسے بہت سی باتیں ان کی طرف غلط بھی منسوب کر دی گئی ہیں، جیسا کہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے اپنی کتاب ''اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش'' میں بہت سی مثالیں دی ہیں کہ خاص طور پر ہمارے ہاں جو باطنی لوگ تھے (جو شیعیت کا ایک شیڈ تھا) انہوں نے اہل سنت کو گمراہ کرنے کے لئے صوفیاء کی طرف بہت غلط باتیں منسوب کی ہیں۔ انہوں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بہت بڑے عالم اور صوفی کسی جگہ گئے تو وہاں ایک مسجد

میں ان کی کتاب کا درس ہو رہا تھا' جسے سن کر انہوں نے کہا کہ توبہ توبہ میں نے یہ بات آج تک کبھی نہیں کی' بلکہ یہ بات تو میرے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی۔

اس اعتبار سے دیکھیں تو یہ بہت بڑی بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم اس کتاب (القرآن) کے خود محافظ ہیں ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴾ کتابِ الٰہی کا محفوظ رہنا بھی آسان کام نہیں ہے جب تک کہ اللہ کا خصوصی فیصلہ نہ ہو۔ اسی لئے تو ایک دَور میں احادیث نبویؐ میں موضوع روایات کا ایک ایسا طومار شامل کر دیا گیا تھا کہ پھر محدثین کو پوری پوری زندگیاں کھپانی پڑیں اور انہوں نے موضوع روایات کو الگ کیا اور صحیح وضعیف احادیث کو بھی علیحدہ علیحدہ کیا۔ اسی طرح اہلِ تصوف کی طرف بہت سی غلط باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ میں نہ تو ابنِ عربی کا وکیل ہوں اور نہ ان کی ہر بات کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ ان کے ہاں جو تضاد موجود ہے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ان ہی کی طرف یہ شعر بھی منسوب ہے کہ ؎

الرّب عبدٌ والعبد ربٌّ
یا لیتَ شعری من المُکلّف!

''ربّ ہی عبد ہے اور عبد ہی ربّ ہے (یعنی خالق ومخلوق ایک ہی ہیں) تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس کو حکم دیا جا رہا ہے (کہ عبادت کرے اور کس کی عبادت کرے!)''

لیکن دوسری طرف ان ہی کا ایک شعر ہے ؎

الرّبّ رَبٌّ وان تنزّل
والعبد عبدٌ وان ترقّٰی

''اللہ' اللہ ہی ہے' چاہے وہ کتنا ہی نزول فرمالے اور بندہ' بندہ ہی رہے گا چاہے جتنا بھی بلند ہو جائے''۔

حضور ﷺ ساتویں آسمان تک گئے ہیں لیکن وہ معبود نہیں بن گئے' بلکہ عبد ہی رہے ہیں۔

میں نے اس مسئلہ کو ایک اور طریقے سے بہت ہی سادگی کے ساتھ حل کیا ہے۔ مجھ پر یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے کہ میری گفتگو' میرا غور وفکر اور میرے اخذ کردہ

نتائج بالکل mathematical اور الجبرا کے فارمولوں کی طرح ہوتے ہیں۔ آج سے ۳۵ سال پہلے میری جو رائے تھی وہ میں بیان کر چکا۔ آج اس ضمن میں میری کیا رائے ہے اور اس کا صغریٰ کبریٰ کیا ہے' یہ میں ان شاء اللہ العزیز اگلی نشست میں بیان کروں گا۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ کے حوالے سے میں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہ رہا ہوں۔ ظاہر اور باطن کے اعتبار سے اس آیت کی کچھ مزید وضاحت ہونی چاہئے تھی جو نہیں ہو سکی۔ اس حوالے سے امام رازی کا ایک قول آپ کو سنانا چاہوں گا۔ اللہ تعالیٰ ظاہر بھی اتنا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی ظاہر نہیں' وہ self evident ہے' آفتاب آمد دلیل آفتاب! اس لئے کہ پوری کائنات درحقیقت اسی کا ظہور ہے۔

معمور ہو رہا ہے عالَم میں نور تیرا
از ماہتاب و ماہی سب ہے ظہور تیرا!

تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر ظاہر کون ہوگا؟

ردائے لالہ و گل' پردۂ ماہ و انجم
جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالَم ہے!

پوری کائنات کے اندر اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت' اس کے علم اور اس کی حکمت کا ظہور ہے۔

وفی کلّ شیءٍ لہ آیۃٌ
تدلّ علی انّہ واحدٌ

ہر شے میں اُس کی نشانی موجود ہے جو یہ دلالت کرتی ہے کہ وہ اکیلا ہے' تنہا ہے۔ لیکن اپنی کُنہ کے اعتبار سے اور اپنی ذات کے اعتبار سے وہ اس قدر باطن اور خفی ہے کہ اسے کوئی نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ کے اس ظاہر اور باطن ہونے میں امام رازی نے بڑی خوبصورت نسبت قائم کی ہے۔ ان کا قول ہے کہ:

ان کمال کونہ ظاھرا سبب لکونہ باطنا' فسبحان من اختفٰی عن العقول لشدۃ ظھورہ واحتجب عنھا بکمال نورہ

''درحقیقت اس کے ظہور کی شدت اور کمال ہی اس کا سبب ہے کہ وہ نگاہوں سے چھپ گیا ہے (سورج جب نصف النہار پر چمک رہا ہو تو آپ آنکھ بھر کر اسے دیکھ نہیں سکتے' اس کی وجہ اس کی شدتِ ظہور ہے جس کے باعث آپ کی نگاہ چکا چوند ہو جاتی ہے۔) بس بڑی پاک ہے وہ ذات جو اپنے شدتِ ظہور کے باعث عقولِ انسانی سے چھپ گئی ہے اور اپنے نور کے کمال کے باعث عقول انسانی سے حجاب میں آ گئی ہے''۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ظاہر اور باطن ہونا تو بیک وقت (simultaneous) ہے اور ان دونوں میں جو گہرا رشتہ ہے اس کی اس طرح تاویل کی جاسکتی ہے جیسے امام رازی نے فرمائی ہے۔ وحدت الوجود کے مسئلہ کو جس طور سے میں نے حل کیا ہے وہ میں اگلی نشست میں عرض کروں گا۔

بارك اللّٰه لی ولكم فی القرآن العظیم

ونفعنی وایاكم بالآیات والذكر الحكیم oo

فلسطین نمبر' اقبال نمبر' عراق نمبر کے بعد ''ندائے خلافت'' کی نئی دستاویزی پیشکش

نظریۂ پاکستان نمبر

مرتبہ: سید قاسم محمود

❁ نظریۂ پاکستان کیا ہے؟ یہ دوقومی نظریئے سے کیوں مختلف ہے؟ ❁ برعظیم پاک و ہند میں نظریۂ پاکستان کا ارتقاء کیونکر ہوا؟ ❁ نظریۂ پاکستان کے برعکس نظریئے ''ہندو مت'' کا تعارف ❁ ہندوؤں نے ایک ہزار سال کی تاریخ میں مسلمانوں کو کیا دیا؟ ❁ اور مسلمانوں نے ہندوؤں کو کیا دیا؟ ❁ اور دوسرے بہت سے گوشے جن کی نقاب کشائی اس خاص نمبر میں پہلی مرتبہ کی جارہی ہے۔

نظریۂ پاکستان نمبر

14/اگست کو شائع ہو رہا ہے۔ ان شاءاللہ!

اقبال کی حکمتِ لَا و اِلَّا

تحریر: محمد سہیل قریشی

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، عربی میں 'لَا' حرفِ نفی ہے، جس کا معنی ہے: ''نہیں'' اور 'اِلَّا' سے مراد ہے: اثبات، یعنی مکمل تصدیق۔ کلمۂ توحید دینِ اسلام میں داخل ہونے کے لئے اوّلین اور لازمی شرط ہے۔ اگر اس کے معانی پر غور فرمالیں تو 'لَا' اور 'اِلَّا' کی حکمت آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ .....ترجمہ: ''(کائنات میں) اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں''۔ اس کلمۂ طیبہ میں سب سے پہلے 'لَا' سے غیر اللہ کی مکمل اور دوٹوک نفی کر دی گئی، اس کے بعد 'اِلَّا' سے اللہ تعالیٰ کے وحدہ لا شریک ہونے کا مکمل اثبات اور اقرار کرالیا گیا۔ آپ 'لَا' اور 'اِلَّا' کے مطالب واضح طور پر سمجھ گئے ہوں گے۔ علامہ اقبال نے اپنے فارسی اور اردو کلام میں ان دو الفاظ کو انہی معانی میں استعمال کیا ہے۔ 'لَا' سے وہ قطعی اور کُلّی طور پر غیر اللہ کی نفی کرتے ہیں اور 'اِلَّا' سے وحدہ لا شریک لہٗ کا مطلب اخذ کرتے ہیں۔ آئندہ اس موضوع کو خاطر خواہ سمجھنے کے لئے ان دو اصطلاحات کا مفہوم پیش رکھنا نہایت ضروری ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں 'لَا' و 'اِلَّا' لازم وملزوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے معبودِ حقیقی ہونے پر ایمان کے لئے لازم آتا ہے کہ اوّلاً ہم پورے وثوق سے غیر اللہ کی نفی کریں اور پھر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے معبودِ برحق ہونے کا اثبات۔ جب تک یہ دو عناصر ایک مسلمان میں جمع نہ ہو جائیں اس کا عقیدۂ توحید درجۂ کمال کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ بجلی کا بلب اُس وقت تک روشن نہیں ہو سکتا جب تک کہ منفی (-) اور مثبت (+) تاریں باہم یکجا نہ ہو جائیں۔ بالکل اسی طرح ایمان کامل کی شمع اُس وقت تک روشن نہیں ہوتی جب تک

'لَا' (-) اور 'اِلَّا' (+) کا اتحادِ عمل میں نہ آ جائے!

ہر ایسی نفی جس کے بعد اثبات نہ ہو محض کفر و الحاد ہے اور اس میں ایمان کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ چنانچہ اپنے علم و مطالعہ، تحقیق، ''ترقی یافتہ'' تہذیب و تمدن اور حیران کن انفارمیشن ٹیکنالوجی کے باوجود مغرب میں لادینیت اور الحاد کا دَور دَورہ ہے۔ نظر کو خیرہ کرنے والی تہذیب حاضر انہیں اس مقام پر لے آئی ہے کہ جہاں وہ نفی (انکارِ وجودِ باری تعالیٰ) کے لئے تو نہایت دیدہ دلیر ہیں لیکن اثبات کی جانب ان کا ایک قدم نہیں اٹھتا! (واضح رہے کہ حرفِ 'لَا' کو علامہ اقبال نے انکارِ باری تعالیٰ کے مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی ملحد قوم یا فرد کا ذکر کرتے ہیں تو وہاں 'لَا' سے ان کی مراد اللہ تعالیٰ کی ہستی سے انکار ہوتا ہے۔) اس ضمن میں یہ نکتہ بھی واضح کر دینا از حد ضروری ہے کہ جس طرح ''نفیٔ بے اثبات'' سے کفر لازم آتا ہے، بالکل اسی طرح ''اِثباتِ بے نفی'' بھی صریحاً گمراہی ہے۔ کوئی مسلمان اگر ''لَا اِلٰـــہَ'' نہ پڑھے اور صرف ''اِلا اللّٰہ'' کا ورد کرتا رہے تو یہ وردِ اسلام کے نزدیک ہرگز قبول نہیں ہوگا۔ اس کفر و الحاد پر علامہ نے بھرپور اور نہایت عادلانہ تنقید کی ہے۔ فرماتے ہیں:

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مئے لَا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانہ اِلَّا (بالِ جبریل)

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ تہذیب حاضر میں 'لَا' (نفی) کا دَور دَورہ ہے اور اثباتِ وجودِ باری تعالیٰ اور توحید کا کہیں وجود نہیں۔ یہ سراسر گمراہی ہے جو دیمک کی طرح شجرِ ایمان کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے اور بالآخر قوم کی اجتماعی موت کا سبب بنتی ہے:

لَا و اِلَّا سازِ برگِ اُمّتاں
نفیِ بے اِثبات مرگِ اُمّتاں

('لَا' اور 'اِلَّا' لازم و ملزوم ہیں اور اُمّتوں کے لئے سرمایۂ حیات، لیکن جہاں نفی کے بعد اثبات نہ ہو وہاں امتوں کی موت یقینی ہے!)

اس بحث کے بعد یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ حکمتِ لَا و اِلَّا فرد اور

(باقی صفحہ 56 پر)

مذہب: انسانی زندگی کی ناگزیر ضرورت

تحریر: ڈاکٹر طاہرہ بشارت ☆

مذہب کی ضرورت کیا ہے اور کیوں ہے؟ اکثر تعلیم یافتہ افراد سنجیدگی سے یہ سوال کرتے ہیں کہ جب انسان اپنی عقل کے مناسب استعمال سے کائنات کی ماہیت و کیفیت کو سمجھ سکتا ہے' اپنی حقیقی برائی و بھلائی کو اچھی طرح جان سکتا ہے اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق انسانی بہبود کے لئے مناسب معاشی و سیاسی اور معاشرتی قوانین مرتب کر سکتا ہے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ مذہب کی داستانِ پارینہ سے چپکا رہے؟

سیّد محمد اسماعیل مذہب کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بے شک انسان اپنی عقل و فراست سے کائنات کی ماہیت و کیفیت کو سمجھ سکتا ہے اور بنی نوع انسان کی بہبود کے لئے بہترین معاشی' سیاسی و معاشرتی نظام ایجاد کر سکتا ہے لیکن علم و عمل کے دونوں بنیادی سوالوں کا کوئی تسلی بخش حل پیش نہیں کر سکتا۔ یہ کام صرف اور صرف مذہب ہی سرانجام دے سکتا ہے۔ مذہب کی بنیادی افادیت یہی ہے کہ وہ علم کے اس بنیادی سوال کا قطعی جواب دیتا ہے کہ تکوین عالم کا مقصد کیا ہے اور عمل کے ذریعے اس بنیادی معمہ کا حل پیش کرتا ہے کہ مفاد پرستی کے جذبات پر حق و انصاف کے تقاضوں کو کس طرح اور کیونکر مقدم رکھا جا سکتا ہے؟ انسانی عقل ہمیشہ ان دونوں سوالوں کے جواب دینے سے قاصر رہی ہے اور یہ عقدہ کشائی الہامی مذہب ہی سے ممکن تھی۔ مذہب کی ضرورت اسی سے عیاں ہے''۔(۱)

مذاہب عالم اور اسلام کے حوالے سے لکھی گئی اکثر کتابوں کے مصنفین مذہب کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں ایک مشترک نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسانی

☆ اسسٹنٹ پروفیسر ادارہ علوم اسلامیہ' پنجاب یونیورسٹی لاہور

زندگی ایک وحدت ہے اور اس وحدت کے مختلف شعبوں پر اگر مختلف اصولوں اور مختلف قوانین کا اطلاق نہ ہو تو وحدت کا شیرازہ بکھر جائے اور انسانی زندگی کا وجود خطرے میں پڑ جائے۔ انسانی زندگی کی وحدت برقرار رکھنے کے لئے اور اسے خطرناک حالات سے بچانے کے لئے مذہب کا کام ہے کہ وہ زندگی کے لئے ایک جامع اور مکمل نظام پیش کرے جو زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہو۔

عبداللہ المسدوسی اپنی کتاب ''مذاہب عالم پر ایک معاشرتی و سیاسی جائزہ'' میں مذہب کی افادیت کے بارے میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''مذاہب عالم انسانی نسل کی ارتقائی تاریخ کے نمائندہ ہیں اور تمدنی و سیاسی تاریخ کے مختلف مدارج کو ظاہر کرتے ہیں۔''(۲)

مذہب کی ضرورت و اہمیت کو انسانی فطرت کے حوالے سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ ماہرین علم سائنس بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسان میں دو قوتیں ہیں:

۱) اعلیٰ ۲) اسفل

پہلی قوت انسان کو بلندی پر چڑھاتی ہے اور دوسری اس کے مدنی الطبع وجود کو نیچے گرا کر اُسے جانوروں کے ہم پلہ بنا دیتی ہے۔ مذہب اس لئے بھی ضروری ہے کہ اعلیٰ فطرت اس کی اسفل فطرت پر غالب آ جائے تا کہ نیکی کی صفت سے مل جل کر رہنے کے قابل ہو جائے اور اپنے ہم جنسوں کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرے۔ فی الحقیقت مذہب ہی کی بدولت انسان کو بلند خیالی اور پارسا زندگی کی توفیق حاصل ہوئی اور یہ بھی مسلّم ہے کہ انسان کی ترقی کے لئے بلند خیالی اور پارسائی کی زندگی گزارنا ضروری ہے اور صرف مذہب ہی وہ روحانی ضابطہ ہے جو انسانوں کو روحانی دانش اور اخلاقی حکمت فراہم کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق لکھتے ہیں:

> ''مذہب سے مراد وہ روحانی دانش اور اخلاقی حکمت ہے جو بنی آدم کو اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرامؑ کی وساطت سے دی تھی۔ انسان دنیا میں کس طرح رہے؟ دوسرے سے اس کے روابط کیسے ہوں؟ مقصد حیات کیا ہو؟ حصولِ عظمت کے لئے کون سے طریقے استعمال کرے؟ یہ وہ مسائل ہیں جن پر انسان نے صدیوں

سے سوچا اور دانشوروں اور فلسفیوں نے مدّتوں دماغ لڑایا مگر وہ کسی معیّن نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ یہ اللہ کا کتنا احسان ہے کہ اس نے بن کہے ہمیں فلاح وعظمت کے تمام راز بتا دیئے' خیر وشر کی تفصیل سمجھا دی اور منزل بھی دکھا دی۔''(۳)

گویا یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مذہب ایک حقیقت' ایک فلسفہ' ایک سوچ' ایک ضرورت' خیالات واعتقادات کا مجموعہ' اَخلاق واعمال کا گلدستہ اور ایک ایسی سچائی ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔ مذہب کو انسانی تہذیب میں ریڑھ کی ہڈی کی اہمیت حاصل ہے۔ مذہب ہر دَور میں کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا۔ اس کا ثبوت آج بھی دنیائے ہستی سے مٹی ہوئی تہذیبوں کے کھنڈرات ہیں' جن کی کھدائی سے مذہب کے موجود ہونے کے کئی ایک شواہد ملتے ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ دَور میں اگرچہ چند اقوام مذہب کا کلیتًا انکار کرتی ہیں' مگر پھر بھی وہ کچھ ایسے بنیادی مقاصد رکھتی ہیں جن کی نوعیت مذہبی شعور سے ہم آہنگ ہے۔

لہٰذا ہم مختصر طور پر اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ مذہب کی افادیت انسانی زندگی میں کہاں کہاں ہے اور انسان مذہب کی ضرورت کہاں کہاں محسوس کرتا ہے۔

(۱) فطری ضرورت

مذہب انسان کا فطری جذبہ اور عالمگیر داعیہ ہے۔ اس کا اعتراف مغربی مفکرین نے بھی کیا ہے۔ ایک جرمن مفکر کے بقول:

''مذہب ابدی چیز ہے' کیونکہ مذہب جس حاسہ اور فطرت کا نتیجہ ہے وہ معلوم نہیں ہو سکتی۔''

اسی طرح ایک فرانسیسی مفکر کہتا ہے:

''مذہب جبلت انسانی میں ایسی ہی فطری چیز ہے جیسے چڑیوں میں گھونسلہ بنانے کا جذبہ فطری ہے۔''(۴)

مسلم مفکرین نے بھی مذہب کو فطری قرار دیا ہے۔ مولانا وحید الدین خان لکھتے ہیں:

''علم الانسان کے ماہرین نے مختلف انسانی معاشروں کا مطالعہ کیا۔ کئی ہزار سال کے تاریخی ریکارڈ کو سامنے رکھ کر انہوں نے انسان کی فطرت کو سمجھنے کی

کوشش کی۔ ان کا متفقہ بیان یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں خدا کا تصور اس طرح پیوست ہے جس طرح بکری سے گھاس' بلی سے گوشت کھانے کی جبلت کو ختم نہیں کیا جا سکتا اسی طرح خدا کو انسانی فطرت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔''(۵)

اسی انسانی فطرت کی طرف قرآن نے یوں اشارہ کیا:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝﴾ (الروم: ۳۰)

''لہٰذا (اے نبیؐ!) یکسو ہو کر دین کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ یہی فطرتِ الٰہی ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی اس خلقت میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ دین قیم یہی ہے' لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

اسی طرح سورۃ الاعراف میں ارشاد ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ۝﴾ (الاعراف: ۱۷۲)

''اور جب آپ کے ربّ نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور انہیں خود اپنے اوپر گواہ بنا کر پوچھا: ''کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟'' تو وہ کہنے لگے: ''کیوں نہیں! ہم یہ شہادت دیتے ہیں''۔ مبادا قیامت کے دن تم یہ کہنے لگو کہ ہم تو اس سے بالکل بے خبر تھے۔''

اس کی تشریح فطرتِ انسانی کے سب سے بڑے شناسا آنحضور ﷺ نے اس طرح کی ہے:

((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ))(۶)

''ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔''

اس کے بعد ماحول بچے کی فطری صلاحیت کو مسخ کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ سیدھی راہ سے بھٹک جاتا ہے اور وہ باطل نظریات کو اپنا لیتا ہے۔ زندگی میں اکثر ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب ایک منکرِ خدا بھی مذہب کی ضرورت محسوس کرتا ہے' حتیٰ کہ مشہور سوشلسٹ اور منکرِ خدا پنڈت جواہر لعل نہرو کو بھی کہنا پڑتا ہے:

''جب مجھے کوئی انتہائی مشکل مسئلہ پریشان کر دیتا ہے تو میرا دماغ ساتھ چھوڑ دیتا ہے' پھر میں مندر جاتا ہوں اور مورتی کے سامنے جھکتا ہوں' آنسو بہاتا ہوں' حتیٰ کہ میری پریشانی ختم ہو جاتی ہے۔''

گویا ہر انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ کسی بالاتر ہستی کی طرف رجوع کرے' قطع نظر اس کے کہ وہ ہستی اس کی مشکل کشا ہو سکتی ہے یا نہیں۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے بالکل درست کہا ہے:

''دنیا میں ہر قوم' ہر نسل' ہر طبقہ کوئی نہ کوئی مذہب رکھتا تھا' عالم و جاہل' رذیل و شریف' شاہ و گدا' افریقہ کا وحشی ہو یا یورپ کا تعلیم یافتہ' سب اس میں برابر ہیں۔''

اس سلسلے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری ہے کہ جس طرح چند افراد کا نطق اور فہم کی صلاحیت سے محروم ہو جانا انسان کے حیوانِ نطق ہونے کی نفی نہیں کرتا یا چند افراد کا جنون انسان کے حیوانِ عاقل ہونے کے منافی نہیں یا کچھ لوگوں کا رہبانیت اختیار کرنا انسانیت کے مدنیت پسند ہونے کی تردید نہیں کرتا بالکل اسی طرح چند منکرین مذہب کا وجود اس بیّن حقیقت کو نہیں جھٹلاتا کہ مذہب انسان کی طبعی ضرورت ہے۔

(۲) روحانی ضرورت

انسان اپنی تخلیق کے لحاظ سے جسم و روح سے مرکب ہے' لہٰذا انسان کی جسمانی ضروریات کے ساتھ ساتھ روحانی جذبات کی تکمیل بھی از حد ضروری ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف مشہور عالم نفسیات James Luba نے اس طرح کیا ہے:

''مذہب ایک روحانی اقتضاء (تقاضا) اور نفسانی حاسہ (محسوس کرنے کی طاقت) ہے جس کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ انسان اور کائنات میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔''(۷)

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

''دلوں اور روحوں کی وہ طب جس کے ذریعے ابدی زندگی حاصل ہوتی ہے' وہ علم و مذہب کا ثمر ہے۔''(۸)

اللہ نے اس روحانی ضرورت کے پیش نظر ہر دَور میں مختلف انبیاءِ کرام علیہم

السلام بھیجے اور ان کی طرف سے بھیجا ہوا پیغام ہدایت و روحانی تعمیر کا باعث بنا۔ پوری نسل انسانی کو یہ خوشخبری سنادی گئی' جس کا ذکر سورۃ البقرۃ میں یوں آتا ہے:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرۃ:۳۸)

''ہم نے کہا: تم سب یہاں سے نکل جاؤ' پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو کوئی میری ہدایت کی اتباع کرے گا تو ایسے لوگوں کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

چنانچہ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ہر زمانے اور ہر قوم کی طرف انبیاء کرام مبعوث کیے تاکہ انسان کی روحانی ہدایت کا سامان فراہم کیا جائے۔

سورۃ النحل میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۭ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ (النحل:۳۶)

''ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیجا (جو انہیں یہی کہتا تھا) کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔ پھر کچھ ایسے لوگ تھے جنہیں اللہ نے ہدایت دے دی اور کچھ ایسے تھے جن پر گمراہی ثابت ہوگئی۔ سو تم زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا!''

سورۂ فاطر میں بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۭ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ (فاطر:۲۴)

''یقیناً ہم نے آپ کو سچا دین دے کر بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے' اور کوئی اُمت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔''

سورۂ یونس میں بھی انبیاء کرام کے مبعوث کرنے کا مقصد بیان کر دیا گیا۔ ارشاد ہے:

﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۞ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞﴾ (یونس:۴۷،۴۸)

''ہر اُمت کے لئے ایک رسول ہے، پھر جب ان کے پاس وہ رسول آتا ہے تو پورے انصاف کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا۔ اور پوچھتے ہیں: اگر تم سچے ہو تو وہ دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟''

جدید دنیا نے مذہب کو انسان کی زندگی سے علیحدہ کر دیا ہے اور روحانی ضرورت پوری نہ ہونے کی بنا پر انسان عدم تحفظ کا شکار ہے۔ مولانا وحید الدین خان اپنی کتاب ''اسلام اور عصر حاضر'' میں برٹنڈ رسل کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

"Animals are happy so long as they have health and enough to eat. Human beings, one feels, ought to be, but in the modern world they are not at least in a great majority of cases" (9)

''جانوروں کو اگر صحت و تندرستی اور وافر مقدار میں خوراک میسر ہو تو وہ خوش ہیں۔ کسی کے خیال کے مطابق انسانوں کو بھی ایسا ہی ہونا چاہئے، لیکن موجودہ دَور میں اکثریت کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔''

تمام انبیاء کرام علیہم السلام ایک ہی روحانی سرچشمے سے سیراب ہوتے رہے اور آگے انسانیت کو سیراب کرتے رہے، حتیٰ کہ آنحضور ﷺ اس روحانی ہدایت کی تکمیل کرنے والے تھے اور اب قیامت تک روحانی پیاس بجھانے کا بہترین ذریعہ دین اسلام ہے، جس میں روحانیت کی تکمیل کے لئے پوری تفصیل موجود ہے، از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ﴾ (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے بحیثیت دین اسلام کو پسند کیا ہے۔''

انسان کے روحانی شعور پر غفلت کے پردے پڑ جاتے ہیں لیکن زندگی کی تلخ

حقیقتیں اس غفلت اور زنگ کے لئے صیقل کا کام دیتی ہیں' جس کا تذکرہ قرآن حکیم کی سورۃ العنکبوت میں یوں آیا ہے:

﴿فَإِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ﴾ (العنکبوت:٦٥)

''پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کی مکمل حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے خالصتاً اسے ہی پکارتے ہیں' اور جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو اس وقت پھر شرک کرنے لگتے ہیں۔''

(۳) جسمانی ضرورت

مذہب جس طرح روح کو پاکیزگی کے بلند درجے تک پہنچاتا ہے اسی طرح جسم کو صحت کی ضمانت بھی فراہم کرتا ہے اور ذہنی پریشانیوں اور اعصابی کشمکش کو دُور کرنے میں مدد دیتا ہے جو ہماری نصف بیماریوں کی ذمہ دار ہے۔ ڈاکٹر اے اے بیرل (A.A.Barral) کے مطابق:

''جو شخص صحیح معنوں میں مذہب کا پابند ہوتا ہے وہ کبھی اعصابی اور ذہنی پریشانیوں کا شکار نہیں ہوتا اور آج علمِ امراض النفس کے ماہرین انجیل مقدس کے مبلغ بنتے جا رہے ہیں۔ وہ لوگوں کو مذہبی زندگی کی تعلیم و ترغیب اس لئے نہیں دیتے کہ انہیں اگلی دنیا میں جہنم کے شعلوں سے بچا سکیں' بلکہ وہ مذہبی زندگی کو اس لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ لوگ اس دنیا کے جہنم کے شعلوں یعنی متعدی ناسور' سوزش سینہ' اعصابی کشمکش اور اختلاجِ قلب سے محفوظ رہ سکیں۔''

ڈاکٹر کیرل (Carrel) جسمانی طب کے بارے میں اپنا تجربہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''پچھلے تیس سالوں میں تمام مہذب ممالک کے لوگوں نے مجھ سے اپنی بیماری کے بارے میں مشورہ کیا اور سارے مریضوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کے مسئلے کا آخری حل مذہبی نقطۂ نظر نہ ہو۔ یہ لوگ اس لئے بیمار ہو گئے تھے کہ وہ اس بڑے سہارے سے محروم ہو گئے تھے جس کو تھام لینے کی مذہب تلقین کرتا ہے اور ان میں سے کوئی بھی اس وقت تک صحت یاب نہ ہوا جب تک اس نے

دوبارہ مذہب کی طرف رجوع نہ کیا۔''

اس طرح ٹیلیسٹی (Talisty) رقم طراز ہے:

''خدا پر ایمان لانے کے بعد میرے باطن میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوا۔ مجھے دنیا سے کوئی محبت نہ رہی اور انسان سے محبت بڑھ گئی اور میں اپنے دشمن تلاش کرنے لگا تا کہ انہیں معاف کردوں اور لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے ہر تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میری روح میں تجلیات کا آشیانہ ہے اور مجھ پر روح القدس کا نزول ہو رہا ہے۔''(۱۰)

بیمار ذہن کی کچھ اور علامات بھی ہیں' مثلاً حسد' بغاوت' غصہ' بداخلاقی' چڑچڑا پن' نفرت' کاہلی' بخیلی' تنگ دستی وغیرہ۔ ان تمام بیماریوں کا علاج علمی اور روحانی مشاغل میں مضمر ہے' مثلاً یہ مطالعہ' عبادت' محویت خداوندی اور تفکر ہی سے ممکن ہے۔

(۴) معاشرتی ضرورت

مذہب جہاں انسان کی فطری' روحانی اور جسمانی ضرورت ہے وہاں وہ انسان کی معاشرتی زندگی کے لئے بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے' کیونکہ انسان فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ مل جل کر زندگی گزارنا اس کی فطری ضرورت ہے' لہٰذا بہتر زندگی گزارنے کے لئے اسے مناسب قوانین وضوابط کی ضرورت ہے۔ اگر معاشرتی زندگی کے لئے کوئی اصول اور ضابطہ نہ ہو تو معاشرہ انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ مذہب انسان کی یہ معاشرتی ضرورت بھی پوری کرتا ہے۔ حضرت آدم اور حضرت حوا (علیہما السلام) پہلا انسانی جوڑا تھا جس نے اس کرۂ ارض پر خدائی ہدایات کے مطابق معاشرتی زندگی کا آغاز کیا' پھر مذہب نے انہیں منظم معاشرے میں رہنا سکھایا۔

معاشرتی زندگی کے بے شمار مسائل ہیں' مثلاً زوجین کے حقوق وفرائض' اولاد کے فرائض' والدین کے حقوق' پڑوسیوں سے تعلقات کی نوعیت' یہ ایسے امور ہیں کہ اگر انسان خود اِن کا تعین کرے تو افراط وتفریط کا شکار ہو جاتا ہے' ظلم وستم اور ناانصافی معاشرے کا حصہ بن جاتی ہے' جیسا کہ انسانی معاشرتی زندگی کی پوری تاریخ اس پر شاہد

ہے۔ اس کے برعکس مذہب انسان پر انسان کی بادشاہی کا مخالف رہا ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ وہ ذات پاک جس نے پوری کائنات اور پوری انسانیت کے لئے قوانین وضع کئے' وہی اس بات کی مستحق ہے کہ انسان کو معاشرت اور اجتماعی زندگی کے بارے میں عادلانہ قوانین عطا کرے۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الاعراف:٥٤)

''یاد رکھو! اسی نے تخلیق کیا ہے تو حکم بھی اسی کا ہے' ربّ العالمین بڑی برکت والا ہے۔''

ماہر عمرانیات ڈاکٹر فرائیڈ لکھتے ہیں:

''اب وقت آ گیا ہے کہ یہ امر تسلیم کر لیا جائے کہ انسان خدا کی راہنمائی کے بغیر قانون نہیں بنا سکتا۔ پھر الہامی قوانین اس لحاظ سے بھی انسان کے خود ساختہ قوانین پر فوقیت رکھتے ہیں چونکہ الہامی قانون اٹل ہوتا ہے' اس میں کوئی ردّوبدل نہیں کر سکتا' لیکن انسانی قوانین زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔''

مولانا مودودیؒ نے بالکل صحیح کہا ہے:

''مذہب کا کمال یہ ہے کہ اس نے انسان کو ایک معاشرہ کی صورت میں منظم کر کے اس کے تمام معاشرتی مسائل کا عادلانہ حل پیش کیا۔ مذہب سے بیگانگی کی بنا پر ہر انسان اس دنیا کا نہیں کسی اور دنیا کا باسی ہوتا۔''

مختلف مفکرین کی ان آراء سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرتی زندگی گزارنے کے لئے مذہب ناگزیر ہے اور کوئی شخص بھی مذہب کا سہارا لئے بغیر پُرسکون اور منظم زندگی نہیں گزار سکتا۔

(۵) اخلاقی ضرورت

انسانی تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ لادینیت اور مذہب سے بیگانگی انسانی اخلاق کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور آج کے انسان کا اخلاقی دیوالیہ پن اس کا کھلا ثبوت ہے۔ علامہ اقبال نے اس کی بڑی عمدہ تصویر کشی کی ہے:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا(۱۱)

زندگی کی شب تاریک صرف مذہب ہی کی روشنی سے منور ہوسکتی ہے جو دنیا کی سب سے بڑی اخلاق ساز قوت ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب ''خطباتِ مدراس'' میں اس حقیقت کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''اس وقت دنیا میں جہاں کہیں نیکی کا اجالا ہے اور اچھائی کا نور ہے، جہاں کہیں بھی نیت کا خلوص اور دل کی صفائی کا اجالا ہے، وہ صرف انہی بزرگوں کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے جن کو تمام لوگ انبیاء کرامؑ کے نام سے جانتے ہیں۔ پہاڑوں کے غار، جنگلوں کی ویرانیاں، شہروں کی آبادیاں غرض جہاں بھی رحم، انصاف، غریب پروری، یتیموں کی سرپرستی اور نیکیوں کا سراغ ملتا ہے وہ اسی برگزیدہ جماعت کے کسی نہ کسی فرد کی دعوت اور پکار کا دائمی اثر ہے۔''(۱۲)

پھر مصنف نے بانیانِ مذاہب کے حسنِ اخلاق اور اعلیٰ کردار کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

''نوح کا جوشِ تبلیغ، ابراہیم کا ولولہ، اسمٰعیل کا ایثار، موسیٰ کی سعی و کوشش، ہارون کی رفاقتِ حق، یعقوب کی تسلیم و رضا، لوط کی جانفشانی اور حضرت ایوب کا صبر (علیہم الصلوٰۃ والسلام) یہی وہ حقیقی نقش و نگار ہیں جن سے ہماری روحانی اور اخلاقی دنیا کا ایوان آراستہ ہے اور جہاں کہیں بھی ان صفاتِ عالیہ کا وجود ہے وہ انہی بزرگوں کی مثالوں اور نمونوں کا عکس ہے۔''(۱۳)

پھر تمام ماہرین اخلاقیات یک زبان ہیں کہ محسن انسانیت محمد مصطفیٰ ﷺ تمام اخلاقِ عالیہ کا مکمل نمونہ تھے جو انبیاء کرام میں علیحدہ علیحدہ پائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ شیخ سعدی نے کہا ہے:

حُسنِ یوسف ' دمِ عیسیٰ' یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

الغرض لادینی تہذیبیں اور منکرینِ مذہب اپنے پیروکاروں میں اخلاق و کردار کے وہ نمونے پیش کرنے سے قاصر ہیں جن کا عملی نمونہ اسلام نے پیش کیا۔ خود آنحضور ﷺ نے اپنی بعثت کا مقصد ہی اعلیٰ اخلاق کی تکمیل قرار دیا۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ)) (۱۴)

''مجھے کریمانہ اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔''

ایک مغربی مفکر ولیم ڈیورنڈ (William Durand) لکھتا ہے:

''مذہب کی پشت پناہی کے بغیر اخلاق کی حیثیت محض زبانی جمع خرچ کی ہے' کیونکہ ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا۔''

غلام جیلانی برق لکھتے ہیں:

''ایک لامذہب انسان کے اعمال نفسانی خواہشات کے دباؤ سے سرزد ہوتے ہیں اور ان کا مقصد پست اغراض کی تسکین ہوتا ہے' مگر ایک بامذہب کا کردار اس سے مختلف ہوتا ہے' اس کے طرزِ حیات میں متانت' وقار' شائستگی' بلند اخلاقی اور سنجیدگی ہوتی ہے۔''(۱۵)

سورۃ الحُجرات میں اخلاقی تعلیمات کا تذکرہ کچھ یوں ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۞ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۞﴾ (الحُجرات: ۱۰'۱۱)

''مؤمن تو سب آپس میں بھائی ہیں' لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اے ایمان والو! (تمہارا) کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے' ہوسکتا ہے کہ وہ ان (مذاق اڑانے

والوں) سے بہتر ہوں' نہ ہی عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں' ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں' اور ایک دوسرے پر طعنہ زنی نہ کرو اور نہ ہی ایک دوسرے کے برے نام رکھو' ایمان کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے۔ اور جو باز نہ آئیں وہی تو ظالم ہیں۔''

(۶) سیاسی ضرورت

مذہب کے بغیر کوئی معاشرہ بھی اپنے سیاسی اصولوں کا تعین نہیں کرسکتا۔ دورِ جدید میں دین اور سیاست کی تفریق کا تصور بہت تیزی کے ساتھ زور پکڑ رہا ہے' یعنی سیاست میں دین و مذہب کی کوئی ضرورت نہیں۔ پروفیسر خورشید احمد اپنی کتاب ''اسلامی نظریۂ حیات'' میں لکھتے ہیں:

''لادینی ریاستیں اپنے معاملات کو مذہبی اور اسلامی ہدایات پر مبنی کرنے کی بجائے محض عقل اور مصلحت سے اپنا کام چلاتی ہیں اور کسی بالاتر قانون کی پابند نہیں ہوتیں' ایسی ریاستیں مذہب کے بارے میں غیر جانبدار بھی ہوسکتی ہیں اور اس کے مخالف بھی۔''

علامہ اقبال اپنی کتاب "Reconstruction of Religious Thoughts in Islam" میں لکھتے ہیں:(۱۶)

''سیاست کی جڑ انسان کی روحانی زندگی میں ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ مذہب ذاتی رائے کا معاملہ نہیں بلکہ وہ ایک سوسائٹی بھی ہے۔''

جیسا کہ اپنے ایک شعر میں بھی انہوں نے اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے:

جلالِ پادشاہی ہو یا جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی(۱۷)

قرآن حکیم کی سورۃ الاعراف میں اس بات کی تصدیق کر دی گئی ہے کہ ساری مخلوق اللہ کی بنائی ہوئی ہے اور اس دنیا میں حکم اللہ تعالیٰ ہی کا چلے گا۔

(۷) معاشی ضرورت

مذہب معاشی و مادی ضروریات کی تکمیل کی ضمانت بھی فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر

غلام جیلانی برق لکھتے ہیں:

''زندگی میں انسان کو سینکڑوں غم ہوتے ہیں' مثلاً روزی کا غم' اولاد کا غم' ان کی تعلیم و تربیت کی فکر' بیماریوں' حادثوں اور موت کا ڈر' یوم حساب کا لرزہ' غرض ان تمام خطرات سے بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم خدائی فیصلوں کے سامنے جھک جائیں۔''(۱۸)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو ربّ العالمین کہا ہے اور زمین میں چھپے ہوئے خزانے چرند پرند اور انسانوں کی مادی ضروریات کی تکمیل کے لئے پیدا کئے۔ سورۂ عبس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کردہ ان تمام مادی ضرورتوں کا تذکرہ کر دیا ہے جس کے بغیر انسان نہ تو زندہ رہ سکتا ہے اور نہ ہی اپنی زندگی کو بہتر طور پر گزارنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ فرمایا:

﴿اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۞ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۞ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۞ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۞ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۞ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۞ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۞ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۞﴾(عبس:۲۵۔ ۳۲)

''ہم نے خوب پانی برسایا۔ پھر عجیب طرح سے زمین کو پھاڑا۔ تو اس میں سے ہم نے اناج (بھی) اگایا اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجور اور گھنے باغات اور پھل اور چارہ اگائے تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے سامانِ حیات کے طور پر۔''

(۸) سکونِ قلب کا ذریعہ

مذہب اور دینی اقدار سے دوری نے آج کے مہذب اور ترقی یافتہ انسان کو ذہنی اذیت اور قلبی عدمِ سکون جیسی لعنتوں سے دوچار کر دیا ہے۔ مادہ پرستی اور طلب دنیا میں ہر شخص پریشان نظر آتا ہے۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے اسے تمام دنیاوی آسائش اور راحتیں تو مہیا کر دی ہیں مگر ہر قسم کے راحت و سکون اور آسائش کے باوجود آج کا جدید انسان حقیقی مسرت اور قلبی سکون سے محروم ہے۔ وہ امن کا متلاشی ہے' لیکن جدید تہذیب' سائنس' فلسفہ اور طب حیرت انگیز ترقی کے باوجود اسے ذہنی

سکون اور قلبی اطمینان دینے میں ناکام رہے ہیں۔ مذہب نے ایک ہی فقرے میں ان ساری بیماریوں کا علاج مہیا کر دیا۔ سورۃ الرعد میں ارشاد ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (الرعد:۲۸)

''جو لوگ ایمان لے آئے اور ان کے دلوں کو اللہ کے ذکر سے اطمینان نصیب ہوتا ہے' اور یاد رکھو! دل اللہ کے ذکر سے ہی مطمئن ہوتے ہیں۔''

بقول شاعر۔

نہ دنیا سے نہ دولت سے نہ گھر آباد کرنے سے
تسلی دل کو ہوتی ہے خدا کو یاد کرنے سے!

اس سلسلے میں تہذیبِ نو کی درماندگی اور جدید سائنس کی ناکامی اور مذہب کی ضرورت و اہمیت کا علامہ اقبال نے اس طرح اعلان کیا ہے۔

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں
خرد کھوئی گئی ہے چار سو میں!
نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبح گاہی
اماں شاید ملے اللہ ہو میں![19]

انجیل میں مختلف طریقوں سے دعا اور مذہب کی اہمیت نیز تمام ذہنی پریشانیوں اور قلبی دکھوں کا علاج پیش کیا گیا ہے۔ انجیل متی میں اس طرح مذہب کی اہمیت بتائی گئی ہے:

''صادق چلاتے ہیں اور خدا سنتا ہے اور انہیں سارے دکھوں سے رہائی دیتا ہے۔ مانگو گے تو تمہیں ملے گا' ڈھونڈو گے تو پاؤ گے' دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے لئے کھولے گا۔ کیوں نہیں کوئی مانگتا؟ جو مانگتا ہے اسے ملتا ہے اور جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے۔''[20]

قرآن مجید نے انجیل کے ان الفاظ کی تصدیق سورۃ البقرۃ میں کر دی ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ﴾ (البقرۃ:۱۸۶)

''اور جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق پوچھیں تو (کہئے) میں قریب ہی ہوں' جب دعا کرنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں دعا قبول کرتا ہوں' لہٰذا انہیں چاہئے کہ میرے احکام بجا لائیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ ہدایت پا جائیں۔''

ہر دَور کے فلاسفہ' صوفیاء اور شعراء نے بھی یہی بات کہی ہے کہ سکونِ قلب کا وسیلہ اور سرچشمہ ذاتِ الٰہی ہی ہے اور جب تک کوئی شخص رحمتِ خداوندی کی بیکراں وسعتوں کو اپنا مسکن نہ بنا لے تو اسے چین نہیں مل سکتا۔ عصرِ حاضر کی شدید روحانی اذیت اور اضطراب کا سبب اللہ تعالیٰ سے ناطہ توڑنا ہے۔ یہاں تک کہ انگریز مفکر بِلی گراہم (Billy Graham) نے اس کا اعتراف کیا ہے:

"You know what it means to act peace with God. you know the price that had to be paid to get exclusive thing, called peace and happiness. I know the men who would write the cheque for a million dollars if they could find peace".(21)

''تم جانتے ہو کہ خدا کے ساتھ امن کا کیا مطلب ہے؟ تم جانتے ہو کہ ان خاص چیزوں یعنی امن اور خوشی کی کیا قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ملین ڈالرز کے چیک دینے کو تیار ہیں اگر انہیں امن میسر آئے۔''

گویا حقیقی سکون صرف بارگاہِ ایزدی میں سربسجود ہونے سے ہی ملتا ہے۔ اسی بات کو قرآن حکیم نے سورۃ الانعام میں بیان کیا ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ﴾ (الانعام: ۸۲)

''جو لوگ ایمان لائے' پھر اپنے ایمان کو ظلم (شرک) سے آلودہ نہیں کیا' انہی کے لئے امن و سلامتی ہے اور یہی لوگ ہدایت پر ہیں۔''

(۹) حیات و کائنات کے مسائل اور مذہب

باشعور انسان کے ذہن میں زندگی کے بعد موت کا تصور' کائنات کی حقیقت و

ماہیت' اس کا آغاز و انجام' نیز پوری کائنات میں انسان کی حیثیت اور انسانی روح کے بارے میں سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ فلسفہ اور سائنس نے بھی ان تمام سوالات کے جوابات اور مسائل کا حل کرنے کی کوشش کی لیکن ان گتھیوں کو سلجھانے میں تلاشِ حق کے یہ تمام ذرائع ناکام رہے' حتیٰ کہ شاعر نے بھی اپنی درماندگی کا اظہار کیا ہے۔ علامہ اقبال سراپا سوال ہیں۔

یہ آفتاب کیا' یہ سپہر بریں ہے کیا؟
سمجھا نہیں تسلسل شام و سحر کو میں
حیراں ہے بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں
رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں! (۲۲)

مختلف فلسفیوں نے بھی اپنی عقل سے ان تمام مسائل کے جواب دینے کی کوشش کی لیکن عقل انسانی کوتاہ اور ناقص ہے اور ان مسائل میں انسانی رہنمائی سے قاصر ہے' جیسا کہ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نُور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے! (۲۳)

نیز عقل کی نارسائی کا ایک دوسرے شاعر نے اس طرح اعتراف کیا ہے۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر نہ انتہا معلوم!

عقل کی طرح فلسفہ بھی' جو اجتماعی فکر کا دوسرا نام ہے' مذکورہ مسائل کا کوئی شافی حل پیش نہیں کر سکا۔ جس طرح لاکھوں اندھے مل کر ایک بینا شخص کے برابر نہیں ہو سکتے اسی طرح انسانوں کی ایک بڑی تعداد بھی وحی کی راہنمائی کے بغیر حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ لسان العصر اکبر الٰہ آبادی نے کہا۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں!

اسی طرح ایک جگہ علامہ اقبال نے فلسفہ کی نارسائی کا اس طرح تذکرہ کیا۔

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو!(۲۴)

یہی معاملہ سائنس کا بھی ہے جس کا انحصار حواسِ انسانی پر ہے' لیکن انسانی حواس محدود ہیں اس لئے سائنس بھی کائنات اور اس کے بنیادی حقائق' حیات بعد الموت نیز جزا و سزا جیسے مسائل حل کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سائنس کے نظریات نئی دریافت سے بدل جاتے ہیں۔ لیکن ان سب کے برعکس مذہب نے ان مسائل کا جو حل بتایا ہے وہی حقیقت پر مبنی اور صحیح ہے' کیونکہ خالق کائنات نے خود اس ضمن میں نوعِ انسانی کی رہنمائی کی ہے اور اپنے انبیاء اور رسولوں کے ذریعے ان بنیادی سوالات کا جواب دیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رہے کہ صحیح مذہب عقل سلیم کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ اس کے تقاضے کے عین مطابق ہوتا ہے۔

سید محمد قطب اپنی کتاب ''اسلام اور جدید ذہن کے شبہات'' میں لکھتے ہیں:

''دنیائے انسان آج بھی کئی مسائل کے حل میں سرگرداں ہے' ہر جگہ انسانیت پر حیوانیت کا غلبہ ہے۔ اخلاقی اعمال کے لحاظ سے دنیا آج بھی مقامِ جاہلیت پر کھڑی ہے جہاں آج سے تیرہ صدی پہلے کھڑی تھی۔ اس وقت بھی مذہب ہی انہیں باطل معبودوں اور جھوٹے خداؤں سے نجات دلائی تھی اور آج بھی مذہب ہی انسانیت کو نجات دلا سکتا ہے۔''(۲۵)

مولانا وحید الدین خان ''اسلام اور عصر حاضر'' میں لکھتے ہیں:

''خدا کی بنائی ہوئی زمین ایک اصلاح یافتہ زمین ہے' یہاں ہر چیز درست طریقے پر قائم ہے' ہر چیز عین وہی کر رہی ہے جو اسے کرنا چاہئے۔ زمین کا نظام انسان کے لئے اپنے معاملات کا معیار اور پیمانہ ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنے عمل کو اسی قدرتی پیمانے سے ناپے اور اس سے مطابقت کر کے اپنے ہر عمل کو درست کرتا جائے۔ اگر انسان ایسا کرے گا تو اس کی سوسائٹی امن اور انصاف کی سوسائٹی ہوگی۔''(۲۶)

(۱۰) مذہب، تہذیب ساز قوت

آغازِ کائنات سے ہی مذہب اور تہذیب کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ جہاں کہیں انسانی زندگی میں سلیقہ، شائستگی، حسن و زیبائش نظر آئے گی وہاں مذہب کا پرچار بھی ہوگا۔ انسانِ اوّل حضرت آدم علیہ السلام نے جب شجرِ ممنوعہ کا پھل کھایا تو لباس سے محروم ہو گئے، مگر جلدی جلدی اپنے جسم کو پتوں سے ڈھانپنے لگے، تو یہ انسانی تمدن کا آغاز تھا۔ ہر دین حق اور سچا مذہب ابدی تہذیبی صداقتوں کا مجموعہ ہے جنہیں خالق کائنات نے انسانوں کی ہدایت کے لئے انبیاء کے ذریعے پہنچایا ہے۔ یہ وہ تمدنی اقدار ہیں جن پر قدامت اور فرسودگی کا سایہ نہیں پڑ سکتا، جو ہر دَور اور ہر زمانے کے لئے یکساں سچی ہیں اور جن میں زمانہ گزرنے کے ساتھ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جس طرح سورج پرانا ہونے کے باوجود ہر صبح دنیا کو روشنی سے منور کر دیتا ہے اسی طرح مذہب اور دینی تعلیمات بھی زمانے کی گردش اور تاریخ کی ہر پیش قدمی کے لئے تازہ پیغام کی علمبردار ہیں۔ ایران کا تمدن ہو یا ہندوستان کی تہذیب، روم کا کلچر ہو یا یونان کی ثقافت، سب پر مذہب کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے۔ پھر جہاں تک اسلامی تہذیب کا تعلق ہے تو اسلام ہی اس کا اوّلین محرک ہے۔ اس سے پہلے عربوں پر وحشت اور درندگی چھائی ہوئی تھی، اسلام آیا تو عرب قوم کے افکار و نظریات میں تہذیبی انقلاب برپا کر دیا اور ان کی زندگی کے چال چلن ہی بدل دیئے۔ الغرض مذہب نے ہر دَور میں تہذیب و تمدن کے ارتقاء اور اس کی آرائش و تزئین میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

(۱۱) مذہب اور موت

مذہب نے ہر زمانے میں انسان کو یہ بشارت دی ہے کہ موت کے ساحل سے آگے ایک غیر فانی زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اس کی منتظر ہے۔ وہاں اس قدر سکون ہوگا کہ وہ اس زندگی کی تمام قباحتوں کی تلافی کر دے گا۔ مذہب نے موت کو تقدس عطا کیا ہے۔ امریکہ کا مشہور فلسفی ولیم جیمز (Willam James) اپنی اوائل

عمری میں آخرت کا منکر تھا مگر اپنی آخری عمر میں اس نے موت کے بعد زندگی کا یقین کر لیا۔ وہ کہتا ہے:

''بڑھاپے میں انسان علم و دانش کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے اور ایک نیا شعور حاصل کر لیتا ہے۔ خدا باکمال لوگوں پر زندگی کا دروازہ بند نہیں کرے گا۔ کائنات میں بے اندازہ معقولیت ہے' اس لئے یہ سمجھنا کہ موت کی ایک پھونک سے شمع حیات گل ہو جائے گی یا انسان چند جملے بول کر خاموش ہو جائے گا' یہ بہت ہی نامعقول بات ہے۔''(۲۷)

علامہ اقبال اسی نقطہ کو یوں بیان کرتے ہیں:

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
انکھ سے غائب تو ہوتا ہے' فنا ہوتا نہیں
یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح؟(۲۸)

ان تمام دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مذہب ایک ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر کوئی انسان بھی زندگی نہیں گزار سکتا۔

پروفیسر مظفر الدین اپنی کتاب A Comparative Study of Islam and other Religions میں مقدمہ ابنِ خلدون کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"Religions are introduced by God in order to lead mankind to eternal blessings. Their objective is worship of God as well as management of wordly affairs so much so to establish a composite state and government on the fundamental principles of religion."(29)

''مذاہب خدا کی طرف سے نافذ کئے گئے' تاکہ ان کے ذریعے ابدی خوش نصیبی حاصل کی جائے۔ ان کا مقصد خدا کی عبادت اور دنیاوی کاموں کے لئے مذہب کے بنیادی اصولوں پر مبنی ریاست و حکومت کا قیام ہے۔''

اب تو مغربی دنیا میں بھی لادینی نظریات کے بادل چھٹ رہے ہیں اور Back

to religion کی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ مغرب کے دانشور اور سائنس دان زیادہ سے زیادہ ہستی باری تعالیٰ کے قائل اور انسانی زندگی میں مذہب کی ضرورت کے حامی نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں تازہ ترین کتاب ہے ''خدا موجود ہے'' جس میں چالیس جدید مغربی ماہرین علمِ ارضیات' فلکیات' حیوانیات' نباتات اور دیگر علوم کے ماہرین نے بھی وجودِ خدا پر عقلی اور سائنسی دلائل پیش کئے ہیں۔ ضرورتِ مذہب پر اس بلند پایہ کتاب سے صرف ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے۔ ماہر حشرات الارض ڈاکٹر ایڈورڈ لوتھر لکھتے ہیں:

''گزشتہ چند سال سے ہماری قوم میں وسیع پیمانے پر مذہبی بیداری پیدا ہو رہی ہے اور اس کے اثرات صرف کالج کی نئی پود میں ظاہر نہیں ہو رہے بلکہ اعلیٰ علمی اور تحقیقی اداروں کی ذہنی فضا میں سرایت کر گئے ہیں اور اس ذہنی تبدیلی میں سائنس کے پیش کردہ دلائل وشواہد نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ کیونکہ ان شواہد نے اس کارخانۂ عالم کے ایک خالق کی ضرورت کو ناگزیر حقیقت ثابت کیا ہے۔''

الغرض مذہب اور خصوصاً سچا مذہب انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ زندگی کی ہر مشکل کا سامنا خوش اسلوبی اور خوش اطواری سے کر سکے۔ مذہب اور خداشناسی کا جذبہ عارضی نہیں بلکہ کوئی آدمی خواہ وہ کیسا ہی ہو' اس کا دل خدائے برتر کی یاد سے خالی نہیں ہوسکتا۔ بقول الطاف حسین حالی۔

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش میں مُغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا!

(مسدس حالی)

مراجع ومصادر

۱) سید محمد اسماعیل: رسول عربی ﷺ' ص ۲۰۲
۲) عبداللہ المسدوسی: مذاہب عالم۔ ایک معاشرتی وسیاسی جائزہ' ص ۱۱۰

۳) ڈاکٹر غلام جیلانی برق: الحادِ مغرب اور ہم، ص ۸۱
۴) بحوالہ مولانا تقی امینی: لامذہبی دَور کا تاریخی پس منظر، ص ۴۶
۵) مولانا وحید الدین خان: اسلام اور عصر حاضر، ص ۱۱۶
۶) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین، ح ۱۲۹۶
۷) بحوالہ عبدالحمید صدیقی: مذہب اور تجدید مذہب، ص ۲۰
۸) حفظ الرحمٰن سیوہاروی: اخلاق وفلسفۂ اخلاق، ص ۴۷۰
9)Bertend Russel: Principles of Construction, p.215
۱۰) ڈاکٹر غلام جیلانی برق: الحادِ مغرب اور ہم، ص ۸۸
۱۱) علامہ اقبال: ضربِ کلیم، ص ۶۹
۱۲) سید سلیمان ندوی: خطبات مدراس، ص ۲۷
۱۳) سید سلیمان ندوی: خطباتِ مدراس، ص ۳۱
۱۴) مالك بن انس، الموطا، باب حسن الخلق، ص ۹۰۴
۱۵) ڈاکٹر غلام جیلانی برق: الحادِ مغرب اور ہم، ص ۸۹، ۹۰
۱۶) پروفیسر خورشید احمد، اسلامی نظریۂ حیات، ص ۵۱۴، ۵۱۶
۱۷) علامہ محمد اقبال: بالِ جبریل، ص ۴۰
۱۸) ڈاکٹر غلام جیلانی برق: الحادِ مغرب اور ہم، ص ۱۰۳
۱۹) علامہ محمد اقبال: بالِ جبریل، ص ۸۳
۲۰) انجیل مقدس (متی کی انجیل) باب ۶، ص ۸، ۹
21)Billy Graham: Peace with God, P 202
۲۲) علامہ محمد اقبال: بالِ جبریل، ص ۱۴۸
۲۳) علامہ محمد اقبال: بالِ جبریل، ص ۸۴
۲۴) علامہ محمد اقبال: بالِ جبریل، ص ۹۲
۲۵) سید محمد قطب: اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، ص ۳۳، ۳۴
۲۶) وحید الدین خان: اسلام اور عصر حاضر، ص ۱۰۱
۲۷) ڈاکٹر غلام جیلانی برق: الحادِ مغرب اور ہم، ص ۸۴
۲۸) علامہ محمد اقبال، بانگِ درا، ص ۲۳۴، ۲۳۵
29)Prof.Muzzaffar-ud-din:A Comparative Study of Islam and other Religions, p23.

اسلامیات کا یہودی پروفیسر

تحریر: پروفیسر احمد الدین مارہروی

بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ برصغیر میں علی گڑھ سے قبل کلکتہ یونیورسٹی نے اپنے ہاں اسلامیات کی تعلیم شروع کرنے کا اہتمام کیا اور گورنمنٹ نے اس کے معلّم کی تنخواہ پانچ ہزار ماہانہ مقرر کی جبکہ بالعموم اس عہدہ کا مشاہرہ ہزار ڈیڑھ ہزار ہوا کرتا تھا۔

۱۹۳۵ء میں اسلامیہ کالج اٹاوہ کا ایک وفد جو ڈاکٹر سر ضیاء الدین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ' ڈاکٹر مولوی بشیر الدین ایل ایل ڈی بانی اسلامیہ کالج اٹاوہ' مولوی طفیل احمد ایڈیٹر رسالہ ''سودمند'' اور مصنف ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' اور راقم الحروف پر مشتمل تھا' جب کلکتہ پہنچا تو ہم نے عمائدین شہر سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ انہی میں کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر' حسین شہید سہروردی وزیر اعظم پاکستان کے چچا' سر حسان سہروردی بھی تھے۔ اس وقت تک اس معلم کا انتخاب عمل میں آ چکا تھا اور اسلامیات کی تعلیم شروع ہوئے تقریباً ایک سال گزر گیا تھا۔ میں نے جب سر حسان سے درخواست کی کہ وہ مجھے اس پروفیسر سے' جس کا نام مجھے ڈاکٹر زکریا معلوم تھا' متعارف کرا دیں تو سب سے پہلے تو انہوں نے مجھے اس نام پر ٹوکا اور فرمایا کہ وہ ڈاکٹر زکریا نہیں بلکہ زکرایا ہے اور نسلاً و مذہباً ایک یہودی ہے۔

اس اطلاع سے جیسی سراسیمگی میرے اوپر طاری ہوئی اس کا اندازہ موجودہ دور کی ذہنیت کے لوگ بمشکل ہی کر سکیں گے۔ بے ساختہ میرے مُنہ سے نکلا ڈاکٹر صاحب آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ فرمایا آپ تو یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر اور لیکچرر رہ چکے ہیں اور بخوبی واقف ہیں کہ اس پایہ کے عالم کا تقرر کس طرح عمل میں آتا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ فرانس' برطانیہ' جرمنی' مصر اور دوسرے ممالک میں اس آسامی کو

مشتہر کر کے درخواستیں طلب کی جاتی ہیں' پھر اس مضمون کے تین جید علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے جس کے فیصلہ پر تقرر عمل میں آتا ہے۔ اس معاملہ میں یونیورسٹی کی عاملہ نے سید سلیمان ندوی' مولانا ابوبکر صدر شعبہ عربی علی گڑھ اور علامہ سعد اللہ پرنسپل عربیک کالج کو نامزد کیا اور ان تینوں کی متفقہ رائے یہی تھی کہ تمام اُمیدواروں میں کوئی بھی علوم اسلامیہ میں اس سے بڑھ کر ماہر نظر نہیں آیا۔ مجھے خود اِس تقرر پر سخت صدمہ اور ندامت ہے' لیکن میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ اس سے ضرور ملیں' اسے پرکھیں اور اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔

چنانچہ میں انہی کی وساطت سے اس یہودی عالم تک پہنچا اور دو طویل نشستوں میں اس کی ذات' خیالات اور تبحر علمی کے جو نقوش ذہن پر مرتسم ہوئے وہ آج تک قائم ہیں۔ بلند قامت' سرخ و سفید رنگت' فرنچ کٹ داڑھی' چھوٹے چھوٹے قدرے گھنگریالے بال' ستواں ناک جس پر سنہری فریم کا نازک سا چشمہ' ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ جس پر عربی وضع کا چغہ' یہ تھی اس کی پہلی تصویر جو میری نظر میں کھب کر رہ گئی۔

ہم دونوں کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی اس نے تعظیماً کھڑے ہو کر خالص عربی لہجہ میں السلام علیکم کہا اور انہی کی طرح مصافحہ کیا۔ میرا تعارف ہونے پر بے ساختہ اس کی زبان سے مرحبا نکلا' جسے اس نے دو مرتبہ دہرایا اور پھر ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی مؤدب بیٹھ گیا۔ ہمارے وفد کی آمد کی اطلاع اسے اخبارات کے ذریعہ ہو چکی تھی۔ گفتگو کا آغاز اسلامیہ کالج سے ہوا۔ میں نے جب نادار طلبہ کے واسطے ایک دارالاقامہ قائم کرنے کا ذکر کیا تو بے حد متاثر ہوا اور کہنے لگا ہماری قوم کو بھی اس کی سخت ضرورت ہے' لیکن یہ سعادت مسلمانوں ہی کو نصیب ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے غریب بھائیوں کی مدد قومی نہیں' مذہبی فریضہ سمجھ کر کرتے رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ ہمارے علم میں تو یہی تھا کہ یہودی دنیا کی سب سے مالدار قوم ہے' تو ہنس کر کہنے لگا کہ اس قسم کے بہت سے افسانے آپ نے پڑھے اور سنے ہوں گے' لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں اگر ایک نہیں ہزاروں قارون بھی ہوتے

تو اس سے بنی اسرائیل کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا تھا؟ ہمارے ہاں غریب اور امیر کا فرق دوسری قوموں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ متوسطین کی تعداد بہت ہی کم ہے' حالانکہ معاشرتی اعتبار سے یہی طبقہ ریڑھ کی ہڈی کہلاتا ہے۔ چند کروڑ پتی دولت کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں اور ان کا دماغ ''زِد فـــزد'' کے چکر میں الجھا ہوا ہے۔ انہیں قوم کے محتاجوں کی بنیادی ضروریات تک کو سمجھنے کی فرصت نہیں۔ پھر ہنس کر کہنے لگا کہ اگر یہ صورتِ حال نہ ہوتی تو ہم میں کارل مارکس (بانی اشتراکیت) پیدا نہ ہوتا۔

گفتگو جب اس نہج پر چل پڑی تو اس کا رُخ خود بخود خاندانی حالات کی طرف مڑ گیا۔ کہنے لگا ہماری قوم عرصہ دراز سے جرمنی میں آباد ہے' لیکن یہودیوں کو وہاں دوسرے نہیں بلکہ تیسرے درجہ کا شہری سمجھا جاتا ہے اور ہمارے خلاف نفرت کے جذبات کچھ زیادہ ہی زوردار ہیں۔ اسکولوں میں طلبہ کا داخلہ دشوار ہوتا ہے۔ سرکاری طور پر تو کسی قسم کی قیود عائد نہیں لیکن عملاً کئی طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ البتہ ایک بات دیکھنے میں آئی ہے کہ جو خوش قسمت طالبِ علم ان مراحل کو خوش اسلوبی سے طے کر لیتے ہیں وہ جرمن طلبہ کے مقابلے میں زیادہ محنتی اور ذہین ثابت ہوتے اور امتحانات میں نمایاں کارکردگی حاصل کرتے ہیں۔

میرے والد موم بتیوں کے تاجر تھے' ہم چار بہن بھائی تھے' گزران متوسط طور پر ہوتی تھی' لیکن والد کی دلی خواہش تھی کہ دونوں بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے پیسہ پیدا کریں اور ساتھ ہی قومی خدمات انجام دیں۔ اسکول زندگی میں مجھے ہمیشہ انعامات ملتے رہے لیکن جب میونخ میں داخلہ کا وقت آیا تو یونیورسٹی کا ہر دروازہ بند پایا۔ ابا جان نے والدہ کو اس پر راضی کر لیا کہ تنگی ترشی سے گزر کریں گے مگر زکریا کو حصولِ تعلیم کی غرض سے بیروت بھیج دیں گے۔ چنانچہ یہی مقام ہے جہاں سے میری موجودہ زندگی کا آغاز ہوا۔ وہاں میرے ہم جماعت' ہم صحبت' ہم مشرب بجائے عیسائیوں کے مسلمان تھے۔ ہمارے مقابلے میں اخلاقی حالت ان کی بھی گری ہوئی تھی لیکن اتنی نہیں جتنی عیسائی طلبہ کی تھی' وہ تو انسانیت ہی سے گئے گزرے تھے' کوئی ظاہری اور باطنی

عیب ایسا نہ تھا جو اُن میں سرایت نہ کر چکا ہو۔ برخلاف اس کے ہمارا اور اہل اسلام کا کھانا پینا بھی ایک تھا اور عقائد کے لحاظ سے بھی ہم میں ایک گونہ ہم آہنگی تھی۔ ان میں سے بعض قرآن پڑھتے تھے جس کو میں سمجھتا نہ تھا لیکن اس کا لہجہ اور ترنم کانوں کو بھلا معلوم ہوتا تھا۔

چند روز کے بعد مجھے خیال پیدا ہوا کہ معلوم تو کروں کہ ان کی کتاب میں کیا لکھا ہے۔ عربی کی کچھ شد بد ہو چلی تھی مگر بہت سی باتیں سمجھ میں نہ آتی تھیں' ایک پروفیسر قریب ہی رہتے تھے ان سے جا کر پوچھ لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ احساس ہونے لگا کہ اس میں وہی کچھ لکھا ہے جو ہمارے صحیفہ مقدس میں موجود ہے' بلکہ بعض امور میں قرآن زیادہ واضح اور بہتر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک وقت دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ تورات کے مقابلے میں یہ کتاب فضولیات سے مبرّا ہے۔ اسی زمانہ میں اخبارات سے معلوم ہوا کہ ایک ہندوستانی مبلغ خواجہ کمال الدین اسلام پر لیکچر دینے یونیورسٹی آرہے ہیں۔ علاوہ مسلمانوں کے میں صرف تنہا غیر مسلم تھا جو اُن کا لیکچر سننے وہاں پہنچا' کیونکہ عیسائی ان سے بہت خائف تھے اور چرچ کی طرف سے ممانعت کر دی گئی تھی کہ اس جلسہ میں کوئی شریک نہ ہو۔ جو باتیں اس مبلغ نے بتائیں وہ اتنی واضح تھیں کہ ان سے انکار ناممکن تھا اور سب کا خلاصہ یہ تھا کہ حقانیت اگر دنیا میں کہیں موجود ہے تو اس کا حامل صرف قرآن ہے۔ اس کے بعد میں نے گہری نظر سے اس کا مطالعہ شروع کر دیا اور جہاں کوئی بات تشریح طلب نظر آئی تو تفاسیر پر نظر ڈالی۔ مفسرین نے اکثر جگہ احادیث کا حوالہ دیا تھا' ان کو دیکھا مگر وہاں بدقسمتی سے ایسے تضاد نظر آئے کہ مجھے ان میں سے بعض کی اصلیت پر شبہ ہونے لگا۔ بہرحال مطالعہ جاری رہا۔ دو ایک مضامین بھی لکھے جن سے ناموری بھی ہوئی اور کچھ پیسہ بھی ہاتھ آنے لگا۔ اب میں نے عربی کو بطورِ زبان سیکھنا شروع کیا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے بعد ہی میرے اوپر قرآن کے جوہر کھلے۔ آج کل کا مسلمان تو اسے پڑھتا ہی نہیں' اور پڑھتا ہے تو سمجھتا نہیں اور سمجھ بھی لیتا ہے تو اس پر عمل نہیں کرتا' مگر میری اپنی رائے ہے کہ اگر دنیا اسلامی فلسفہ کو

اپنا لے تو ہر قسم کے معاشی اور اقتصادی مصائب دور ہو سکتے ہیں۔

یہ تمام گفتگو وہ یہودی اس جوش و خروش سے کر رہا تھا کہ اس میں خلوص اور عقیدت کی جھلک صاف نظر آتی تھی اور مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ اس کے باوجود اس نے اسلام کا دامن اب تک کیوں نہیں تھاما۔ لیکن یہ وقت اس سوال کا نہ تھا' اس لئے ہم نے اسے کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھا اور بیچ میں ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اس دوران والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نے کام بند کر کے ملازمت اختیار کر لی۔ بھائی بھی کسی دھندے میں لگ گیا۔ میں اب آزاد تھا' کچھ عرصہ کے واسطے مصر چلا گیا۔ مکّہ و مدینہ جانے کی اجازت نہ ملی' اس لئے ان کی زیارت کا اشتیاق دل میں لئے دِمشق اور بغداد گیا اور وہاں کے علماء اور فضلاء سے ملاقات کی۔ رفتہ رفتہ اسلامی فقہ پر غور کرنے کا موقع ملا تو اس سے دلچسپی پیدا ہوئی' کیونکہ یہودیوں اور مسلمانوں کا اختلاف یہیں آ کر کھلتا ہے اور اس کا مطالعہ نہ صرف پُر از معلومات بلکہ دلچسپ بھی ہے۔ میں نے اس پر مختلف مضامین لکھے اور بالآخر اسی فن پر جرمن زبان میں ایک مقالہ تحریر کیا جسے برلن یونیورسٹی نے اپنے معیار پر پرکھا اور مجھے زبانی امتحان کے واسطے طلب کیا۔ انہوں نے مجھ سے جو سوالات کئے ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لئے کسی چابک دست اور آزمودہ کار غواص کی ضرورت تھی' لیکن میں نے ان متعصب عیسائیوں کو ایسے دندان شکن جواب دیئے کہ انہیں مزید سوالات کی جرأت نہ ہوئی اور مجھے ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ترین ڈگری دینی پڑی۔ مگر ملازمت کے واسطے مجھے پھر غیروں کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ یہاں آئے مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن میں دیکھتا ہوں کہ میرے طالب علم تو ہر طرح مطمئن ہیں لیکن بعض متعصب مذہبی حلقوں سے میرے خلاف کچھ نہ کچھ زہر افشانی ہوتی رہتی ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ بعض مذہبی مسائل پر اس یہودی عالم کے خیالات معلوم کروں لیکن جب میں نے دیکھا کہ اس کی نظر بار بار گھڑی کی طرف اٹھ رہی ہے تو وعدۂ فردا لے کر اٹھ آنے میں ہی مفر نظر آیا۔ اس نے بھی معذرت کی کہ کلاس لینے کا وقت آ گیا

ہے۔ آئندہ کسی شام کو گھر آنے کی تکلیف گوارا کریں اور چائے کی پیالی پر بات چیت ہو تو زیادہ لطف آئے گا۔

(۲)

جوانی کا جوش تھا کون زیادہ انتظار کرتا۔ اگلے دن پانچ بجے شام کو کوٹھی پر جا پہنچا۔ سادہ سا مکان' معمولی سا فرنیچر' لیکن ڈرائنگ روم ایرانی قالینوں' گاؤ تکیوں اور جھاڑ فانوس سے آراستہ اعلیٰ مشرقی تہذیب کا نمونہ تھا۔ پروفیسر سفید قمیص اور خاکی نیکر پہنے کوئی عربی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ ہاتھ میں فنجان تھا جس کی چسکیاں بھی لے رہا تھا۔ ملازم کوئی تھا نہیں جو میرے آنے کی اطلاع کرتا' نہ دروازے پر پردہ تھا کہ حجاب ہوتا' بے تکلف اندر پہنچ گیا۔ تذبذب ہوا کہ سلام کس طرح کیا جائے۔ آخر یہی مناسب سمجھا کہ اسلامی طریقے پر السلام علیکم کہہ کر مخاطب کروں۔ اس پر کچھ ایسی محویت طاری تھی کہ میری آواز سن کر چونک پڑا اور مرحبا' مرحبا کی رٹ لگا دی۔ مجھے بٹھا کر اندر گیا اور ایک تھالی میں چائے دانی اور فنجان لے کر آ گیا۔ گفتگو شروع ہوئی تو کہنے لگا کہ میں نے ہندوستان آ کر دیکھا ہے کہ مسلمان طلبہ میں مذہبی معلومات کی بے انتہا تشنگی ہے' لیکن یہاں کے علماء اس کو بجھانے میں ناکام ہیں۔ کچھ یہی کیفیت آپ کی بھی معلوم ہوتی ہے۔

میں نے کہا میرا زاویۂ نظر قدرے مختلف ہے' میں تو اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کے علم میں جو تضاد ہے اس کی وجوہات معلوم کروں۔ مثلاً آپ نے قرآن میں پڑھا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام سے بڑی سختی کے ساتھ کہا ہے کہ اگر سود کا کاروبار بند نہ کرو گے تو خدا اور اس کے رسول کا تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے اور آپ کی قوم مسلمہ طور پر سود خوار ہے۔ اگر آپ کا اور ہمارا خدا ایک ہے تو وہ دو متضاد احکام کس طرح جاری کر سکتا ہے؟ ایک عام یہودی تو ہمارے خدا' رسول اور قرآن کو تسلیم نہیں کرتا مگر آپ تو قرآن کی حقانیت کے قائل ہیں' پھر اس گتھی کو کس

طرح سلجھائیں گے؟

کوئی اور عالم ہوتا تو میرے اس اعتراض پر ناراض نہیں تو جز بز ضرور ہوتا' مگر کیا مجال جو اُس کی پیشانی پر شکن تک آئی ہو۔ مسکرا کر کہنے لگا آپ یہی کہنا چاہتے ہیں کہ یہودیوں کے ہاں سود حلال ہے۔ تو معاف کیجئے گا خود آپ کی قوم میں کتنے مالدار ہیں جو سود در سود نہیں لیتے اور اس پر غضب یہ کہ اپنے خدا کو دھوکہ دینے کے واسطے اس کا نام بدل کر منافع رکھ چھوڑا ہے' کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ میں نے سود کو نا جائز قرار دیا ہے اور منافع کو حلال گردانا ہے۔ آپ کا قرآن ہی کہتا ہے کہ جب یہودیوں نے سبت کے معاملہ میں اس قسم کی دھوکہ بازی سے کام لیا تو اس گروہ کو بندر بنا دیا گیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ کیا آپ کی مثال اس شخص کی سی نہیں ہے جو شیشے کے گھر میں بیٹھ کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا اور دوسروں پر خشت باری کرتا ہے! میں نے جب یہاں آ کر چھان بین کی تو یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا کہ آپ کے نام نہاد علماء تک اپنی دولت میں اضافہ کے واسطے نہ صرف سود لیتے ہیں بلکہ اس خیال سے کہ قوم میں نکو نہ بن جائیں' اس خود ساختہ منافع کو جائز اور حلال قرار دینے کے واسطے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارا جو وفد کلکتہ آیا ہوا تھا اس میں مولوی عقیل احمد صاحب بھی شامل تھے جنہوں نے سود کے جواز میں ایک رسالہ ''سود مند'' جاری کر رکھا تھا' جو مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو اس پر آمادہ کرتا تھا کہ اپنی معاشی حالت کو درست کرنے کے لئے سود یا منافع کی ایک ایک کوڑی تک وصول کریں۔ میری خوش قسمتی تھی کہ اسے اس کا علم نہ تھا ورنہ الٹی آنتیں گلے پڑ جاتیں۔

اپنی بات کو زیادہ مؤثر بنانے کے لئے وہ یہودی اپنے بحر فطانت سے دور کی کوڑی لایا۔ ہماری بے راہ روی کی مثال پیش کرتے ہوئے کہنے لگا کہ آپ لوگوں کے پاس ایک جیتی جاگتی زندہ کتاب موجود ہے' لیکن جب آپ صرف تیرہ سو برس میں اس مخالف سمت میں چلنے لگے جس کی نشان دہی آپ ہی کے بقول قرآن یہودیوں کے بارے میں کر رہا ہے تو ہم نے جو ہزار ہا سال کی خود فراموشی اور ربّیوں (علمائے یہود)

کی کجروی اور گمراہی کے باعث جو روش اختیار کی اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ اگر آپ اُس اسلام کو دیکھیں جس کی قرآن تعلیم دیتا ہے اور پھر اپنی قوم پر گہری نہیں' اچٹتی ہوئی نظر ڈالیں تو آپ بھی میری طرح اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ محمد ﷺ کے زمانے میں یہودیوں کی اخلاقی حالت اتنی گری ہوئی نہیں تھی جتنی' معاف کیجئے' آج آپ کی ہے۔ میں ایک معمولی سی مثال پیش کرتا ہوں۔ قرآن میں ایک سورۃ الحجرات ہے جس میں بعض معاشرتی خرابیوں کو نمایاں کر کے ان کے متعلق بڑے سخت احکامات صادر فرمائے گئے ہیں۔ انہی میں سے ایک یہ ہے کہ کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی نہ کرو۔ اور اس خرابی کو زیادہ نمایاں کرنے کے واسطے کہا گیا ہے کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے تم اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھاؤ۔ لیکن میرے پاس جو لوگ آتے ہیں ان میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوتا ہوگا جو کسی کی غیبت نہ کرے اور یہ تو آپ کو بھی علم ہوگا کہ آپ کے نام نہاد علماء اس صف میں کتنے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔

میں گیا تو اس خیال سے تھا کہ اس سے کہوں گا کہ جب تم اسلام کی حقانیت کے اس درجہ قائل ہو تو آج تک جامۂ یہودیت کیوں پہنے ہوئے ہو؟ اسے اتار دو اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاؤ' لیکن کچھ عجب اتفاق ہوا کہ اس نے میرے کہے بغیر ہی اس مسئلہ کو چھیڑ دیا۔ کہنے لگا لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟ میں کہتا ہوں کیا فائدہ؟ جارج برناڈ شا میری طرف سے جواب دے چکا ہے کہ جب میں اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں تو دل بے اختیار چاہتا ہے کہ مسلمان ہو جاؤں' لیکن جب خود مسلمانوں کو دیکھتا ہوں تو طبیعت برگشتہ ہو جاتی ہے۔ موسوی اور محمدی شریعتیں ایک ہی خدائے واحد کی وضع کردہ ہیں' جن میں جزوی اختلافات ہوں' مگر اصول دونوں کے یکساں ہیں۔ اگر دونوں اپنی اصل پر قائم رہتے تو جو اختلافات آج نظر آ رہے ہیں اتنے نمایاں نہ ہوتے۔ میں نے اکثر مذاہب بالخصوص عیسائیت کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلام اور حقیقی یہودیت میں جتنی مماثلت پائی جاتی ہے وہ دنیا کے کسی دو مذاہب میں نہیں ملتی' لیکن معاف کیجئے گا اس وقت خدا کی ترازو میں ہم

دونوں ہم پلہ ہیں اور دونوں ہی اصل سے بہت دور جا پڑے ہیں' اس لئے میرے نزدیک مذہب کی تبدیلی کے معنی ہوں گے کہ کیچڑ سے نکل کر دلدل میں پھنس جاؤں۔

اُس وقت تو یہ فقرہ میرے ذہن میں نہیں کھٹکا تھا لیکن بعد میں جب غور کیا تو اندازہ ہوا کہ اس کی یہودی ذہنیت اپنے مذہب کے مقابلے میں' خواہ وہ کتنا ہی کثیف ہو' اسلام کو حقیر اور کم درجہ سمجھتی ہے۔ کیچڑ سے انسان نکل سکتا ہے لیکن دلدل میں پھنس کر کہیں کا نہیں رہتا اور بالآخر غرق ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اس نے بڑی تفصیل سے وہ امور گنوانے شروع کئے جو دونوں مذاہب میں مشترک ہیں' مثلاً بڑے فخریہ طور پر بتایا کہ ذبیحہ اور ختنہ صرف ہمارے ہی مذاہب میں آج تک رائج ہیں۔ آسمانی کتب کے تصور اور تقدیس کا بھی یہی حال ہے' لیکن ہماری قوم بعض ایسی خصوصیات کی حامل ہے جو کسی دوسری کو حاصل نہیں' مثلاً حضرت اسحٰق (علیہ السلام) کے زمانے سے جن کے فرزند حضرت یعقوب یا اسرائیل (علیہ السلام) تھے جس سے ہم اپنے کو منسوب کرتے ہیں' یہ نسل خدا تعالیٰ کی منظورِ نظر رہی۔ اس میں بگاڑ بھی پیدا ہوئے' بغاوتیں بھی ہوئیں' دشمنوں نے ہمارے مقدس مقامات کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ہم نے مصر اور بابل میں غلامی کا بدترین دَور بھی دیکھا' لیکن ہر بار بارگاہِ ایزدی سے ہم کو مدد دی گئی اور رہنے کے واسطے ایسا سرسبز و شاداب وطن عطا ہوا جس کی قرآن تک تعریف کرتا ہے۔ ہدایت کے واسطے پے در پے صاحب معجزہ پیغمبر مبعوث ہوئے۔ کتابیں اور صحیفے بھی نازل ہوتے رہے۔ گمشدہ تورات دوبارہ عطا کی گئی اور ہمارے پیغمبر حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی بنائی ہوئی مسجد کو وہ عظمت عطا ہوئی کہ اہل اسلام بھی ابتداءً اسے اپنا قبلہ تسلیم کرتے رہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام کے عرب کو دیکھئے تو بنجر ملک میں ایک بُت خانہ بنا ہوا تھا اور پیغمبروں کی تاریخ دیکھئے تو صرف دو۔

میں حضور پرنور ﷺ کی تعریف میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ میرے مافی الضمیر کو سمجھ گیا اور کہنے لگا کہ میں حضور ﷺ کی عظمت کا دل و جان سے قائل ہوں اور اس حد

تک معتقد ہوں کہ اگر آپ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوتے تو میں آج بجائے ڈاکٹر زکرایا کے محمد احمد ہوتا۔ آپ کے یہ دونوں نام معنویت کے لحاظ سے مجھے بے حد پسند ہیں اور صرف یہی نہیں میں آپ کو اسم با مسمیٰ سمجھتا ہوں۔ آپ میں وہ تمام صفات یکجا تھیں جن کے مجتمع ہونے سے ایک انسان کامل فرشتہ بن جاتا ہے۔ آپ ان کی مدح میں شعر گاتے ہیں' ان کے اتباع میں داڑھیاں رکھتے اور کھانے کے بعد انگلیاں چاٹتے ہیں' لیکن ان کے اخلاق' مروّت' ہمدردی' رواداری اور ایثار جیسی اصلی صفات کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے۔ آپ کی عبادتیں اگر مخلصانہ بھی ہوں تو وہ اپنی ذات تک محدود ہیں۔ آپ کے علماء قومی اور اجتماعی زندگی سے علیحدہ ہو کر منبر و محراب کی زینت بنے بیٹھے ہیں اور کھوکھلے وعظ کہتے ہیں۔ رہ گئے عوام تو ان کے ہاں مذہب صرف رسوم کا نام رہ گیا ہے۔ اس پر مجھے علامہ اقبال کا وہ شعر یاد آیا۔

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں' تو باقی نہیں ہے!

خود اس کے علمی خزانے میں بھی اس قسم کا ایک انمول موتی چھپا ہوا تھا۔ الماری میں سے ایک کتاب اٹھا لایا جس کا نام اس کی پشت پر Islam on the Coss-road چھپا تھا۔ ایک جگہ پر نشانی رکھی تھی' وہ صفحہ کھول کر اُس نے حافظ شیرازی کا یہ شعر پڑھا۔

گر مسلمانی ہمیں ست کہ حافظ دارد
وائے در گر پس امروز بود فردائے

''اگر مسلمانی اسی کا نام ہے جس کا حافظ دعوے دار ہے تو اس آج پر اگر کل ہوئی تو اس پر افسوس ہی کرنا پڑے گا۔''

[redacted] ہی کو احساس ہو رہا تھا کہ اس گفتگو سے بجز تلخی اور ناگواری کے کچھ حاصل نہ [redacted] لئے میں نے اس کا رخ یہودیت سے عیسائیت کی طرف پھیرا۔ اس نے بھی پہلو بدلا اور ایک خوش آئند مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا یہ موضوع بہت دلچسپ ہے' ان غریبوں کا تو سچ پوچھئے کوئی الوہی مذہب ہی نہیں۔ ہم تو خیر عیسیٰ کو پیغمبر ہی تسلیم

نہیں کرتے' بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے آنے سے قوم میں کچھ رخنہ اندازی ہی واقع ہوئی' خود عیسائیوں سے بھی اس سوال کا جواب بن نہیں پڑتا کہ حضرت آدمؑ جو بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے تھے وہ تو خدا کے بیٹے نہ بن سکے اور یوسف نجار اور مریم کے صاحبزادے کس طرح فرزندِ خداوند بن گئے؟ کس نے انہیں بیٹا بنایا؟ اس کی سند کہاں ہے؟ پھر اس بیٹے کو ہماری قوم نے سولی پر چڑھا دیا اور مقتدر باپ نے انگلی تک نہ اٹھائی۔ قرآن نے ان کے متعلق جو کچھ بتایا ہے وہ تو سمجھ میں آتا ہے اور اس سے اس کی شان کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے' لیکن عیسائیوں کی منطق تو پادریوں کی عقل سے بھی ماورا ہے۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ انجیل جسے قرآن آسمانی صحیفہ تسلیم کرتا ہے' صفحۂ ہستی سے ایسی غائب ہوگئی کہ اس کا کچھ پتہ نہیں لگتا۔ اب جو چار کتابیں ہیں ان کی حیثیت آپ کی صحاحِ ستہ سے کچھ زیادہ نہیں کہ یسوع نے یہ کہا اور یہ کہا۔ جب سوال کیجئے کہ خدا نے کیا کہا تو جواب دیتے ہیں کہ خدا ہی تو ان کے مُنہ سے بول رہا ہے' مگر ہم اس کے مقابلہ میں یہ دلیل لاتے ہیں کہ وہ بجائے ایک مُنہ کے چار مُنہ سے کیوں بولتا ہے؟ اب ان کا مذہب صرف حدیث مسیحی تک محدود ہے' اور معاف کیجئے گا آج آپ بھی اس معاملہ میں انہی کے پیروکار ہیں' آپ نے قرآن کریم کو چوم چاٹ کر اور برکت کی نشانی بنا کر طاق پر رکھ دیا ہے اور حدیث کو جو ترجیح دی ہے وہ انہی کی تقلید نظر آتی ہے۔ آپ کے علماء کے ہاں قرآن کی حیثیت کیا ہے اور اس کے مقابلے میں بخاری شریف کو کتنی فضیلت اور اہمیت حاصل ہے؟ جس طرح ہمارے ربی (علماء) عوام کو تورات کے احکام سے دور رکھنا چاہتے ہیں اسی طرح آپ کے مولوی صاحبان نے بھی آپ کو اصل شاہراہ سے ہٹا کر لوپ لائن کی طرف موڑ دیا ہے اور آپ اسی کو شاخ نبات سمجھ رہے ہیں۔ آپ کے ہاں اس رمز کو سمجھنے والے پہلے شاہ ولی اللہ گزرے جنہوں نے اپنے مدرسہ میں قرآن کی تعلیم شروع کی اور اِس دور میں مولانا ابوالکلام آزاد ہیں' لیکن بظاہر دونوں کی آوازیں صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہیں' کیونکہ عوام پر مولویوں کی گرفت زیادہ وسیع اور مضبوط نظر آتی ہے۔ ایک بات البتہ یقینی ہے کہ اگر دنیا پر کوئی ایسا وقت

پڑا کہ اسے خدائی مذہب کے زیر سایہ ہی فلاح و بہبود نظر آئی تو یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کے پاس آسمانی کتابیں موجود ہیں اور وہ ان کی طرف واپس آ سکتے ہیں' لیکن یہ قوم (عیسائی) تو اپنے ہاتھوں اپنا بیڑا غرق کر چکی ہے۔ ان کا یہ عقیدہ کہ مسیح نے مصلوب ہو کر ان کے تمام گناہ اپنے سر لے لئے ہیں' انہیں خدا پرستی کی طرف لے جا ہی نہیں سکتا۔

اس کے بعد میں نے حدیث کی اہمیت کا ذکر چھیڑا تو اس نے نہایت فراخ دلی سے اعتراف کیا کہ یہ مسلمانوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کی دوسری مثال صفحۂ ہستی پر موجود نہیں۔ محدثین کی محنت اور کاوش کی داد نہ دینا بہت بڑا بخل ہے' لیکن میں ساتھ ہی یہ بھی کہوں گا کہ آپ نے اس کو ضرورت سے زیادہ اونچی جگہ دے دی ہے اور لوگ اسے قرآن سے بھی افضل سمجھنے لگے ہیں' حالانکہ اس میں ایسے اختلافات بھی موجود ہیں کہ ایک ہی صحابی سے ایک موضوع پر متضاد حدیثیں مروی ہیں اور آپ اس تضاد کے باوجود انہیں ناقابل استرداد گردانتے ہیں۔ پھر آپ نے محدثین کے درجے مقرر کر رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف فرقوں کی حدیثیں جداگانہ ہیں جن میں بیّن فرق نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں تو یہی آتی ہے کہ آپ نے قرآن کا دامن چھوڑ کر رسول کی محبت میں خالق و مخلوق کے فرق کو بھلا دیا اور حدیث کو قرآن کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دے دی' حالانکہ حدیث دراصل قرآن کی تفسیر ہے' جبکہ علوم و ہدایت کا سرچشمہ تو بہرحال قرآن ہے۔

دورانِ گفتگو ہم میں سے کسی کو بھی وقت کا احساس باقی نہ رہا تھا' حتیٰ کہ آفتاب غروب ہو گیا اور کسی دُور کی مسجد سے اذان کی صدا بلند ہونے لگی۔ یہودی عالم نے میری طرف کچھ ترچھی نگاہوں سے دیکھا اور دریافت کیا کہ کیا آپ نماز پڑھتے ہیں؟ اثبات میں جواب سن کر پہلے تو وہ غسل خانہ میں گیا۔ پانی کا جگ پہلے تو تین مرتبہ اچھی طرح دھویا اور کہنے لگا اب یہ آپ کی شریعت کے مطابق بالکل مطہر ہے' باطمینان وضو فرمائیے' سلیپر پہن کر باہر تشریف لائیے اور فریضۂ مغرب ادا کیجئے۔ باہر نکلا تو قبلہ رخ

جاپانی جائے نماز بچھی ہوئی تھی۔ بولا کئی ماہ ہوئے' اس خیال سے خرید لی تھی کہ آپ میں سے جو لوگ میری ملاقات کو آئیں وہ اس پر صلوٰۃ پڑھیں لیکن آپ پہلے شخص ہیں جو اسے استعمال کر رہے ہیں۔

میں نماز پڑھتا رہا اور وہ بدستور اپنے رسالہ میں منہمک رہا۔ فارغ ہوا تو کہنے لگا میں نے نماز کے فلسفہ پر بہت غور کیا ہے اور اس پر ایک جرمن رسالے میں مضمون بھی لکھا ہے۔ اس میں اخلاقی' جسمانی اور طبی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے' لیکن اس کا اعلیٰ ترین پہلو وہ دماغی یکسوئی ہے جو انسان کو اپنے خالق سے منسلک کر دیتی ہے۔ ہندو سادھوؤں کا گیان' عیسائی تارکانِ دنیا کی ریاضت اور صوفیائے اسلام کا مراقبہ اس کے آگے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ رہ گئی رسم صلوٰۃ تو اسے آپ مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں۔

وقت بہت ہو گیا تھا' لیکن ابھی اسلامی فقہ پر اس کے خیالات معلوم کرنے باقی تھے جس پر اُس نے بڑی تحقیق کر کے ڈگری حاصل کی تھی۔ میرے سوال پر اس نے کہا کہ میری دانست میں اگر دنیا سے تمام علوم ناپید ہو جائیں اور صرف اسلامی فقہ باقی رہ جائے تو انسانی زندگی کو ہمہ گیر' باقاعدہ اور خوش آئند بنانے کے واسطے صرف یہی نسخہ کافی ہے۔ اس کے بعد اسے کہیں اور جانے اور نئے علوم کے ذخائر تلاش کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہو گی۔ کیا کچھ محنت ان بزرگوں نے کی ہے' کتنی دماغ سوزی اور موشگافی سے کام لیا ہے' زندگی کے کسی شعبہ کو بھی تو نہیں چھوڑا اور ہر چیز کو پانی کر کے رکھ دیا۔ ہمارے ہاں بھی یہودی فقہ ہے لیکن اس میں جانبداری ہے' تصنع ہے' بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اس میں ریاکاری کو بھی دخل ہے' لیکن آپ کے ہاں اس قسم کی کوئی بات نہیں۔ رہ گئے عیسائی تو ان کے ہاں فقہ جیسی کوئی شے شروع سے ہے ہی نہیں اور جو ہے بھی تو وہ عوام کے لئے ناقابل قبول ہے۔

میں نے ائمہ فقہ کے باہمی اختلافات کا ذکر کیا تو کہنے لگا کہ انسانی دماغ کی صلاحیتیں اتھاہ ہیں اور ان میں اتنا تنوع ہے کہ دو حقیقی بھائی ایک ہی ماحول میں پرورش پاتے اور ایک ہی بیج کی پیدائش ہوتے ہیں بالعموم ہم خیال نہیں ہوتے۔ ان سب نے

اپنی صوابدید کے مطابق قرآن و حدیث کی روشنی میں تمام مسائل کا تجزیہ کیا۔ فرق یہ ہے کہ کسی نے انتقاء کو مقدم رکھ کر کچھ سختی سے کام لیا اور کسی نے ''لا اکراہ فی الدین'' کے تحت مذہب کو سہل الحصول بنانے کے واسطے کچھ نرمی برتی۔ میرا رجحان امام شافعی کی طرف ہے' لیکن بعض معاملات میں امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگرد ابو یوسف کے فتاویٰ زیادہ قابل قبول نظر آتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ یہ فن ایک زمانہ تک پہنچ کر ختم ہو گیا۔ وقت کے ساتھ نئے نئے مسائل پیدا ہوتے جاتے ہیں' اجتہاد کی جگہ جگہ ضرورت پڑتی ہے' لیکن اب کوئی ویسا جید عالم سامنے نہیں آتا جو اِن کا حل تلاش کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے' پہلے خود سیکھے پھر دوسروں کو سکھائے۔

آخر میں کہنے لگا معاف کیجئے' میں نے آپ کی کافی سمع خراشی کی' بعض تلخ اور ناگوار باتیں بھی کیں' صرف اس واسطے کہ آپ جویائے علم بن کر میرے پاس تشریف لائے۔ اس طرح کا جب کوئی تشنہ علم میرے پاس آتا ہے تو میں انتہائی کوشش کرتا ہوں کہ اس کی تشنگی دور ہو جائے اور دماغی الجھنیں یکسر دور نہ ہو سکیں تو کم از کم ان کو سلجھانے کا طریقہ سمجھ میں آ جائے۔ آپ مجھ سے آئندہ بھی مل سکتے ہیں۔ افسوس کہ پھر اس کا موقع تو ہاتھ نہ آ سکا لیکن اس کے بعد یہ خلجان مجھے ہمیشہ ستاتا رہا کہ یہ یہودی پروفیسر اپنے طلبہ کو کس قسم کی تعلیم دیتا ہوگا اور وہ کس ذہنیت کے مسلمان بن کر یونیورسٹی سے نکلتے ہوں گے۔ 00

بقیہ: حکمت اقبال

ملت کی ترقی اور اسے قائم و دائم رکھنے کے لئے از بس ضروری ہے۔ توحیدِ باری تعالیٰ ہی ملت اسلامیہ کی بنیاد ہے۔ لہٰذا ہماری بقا اور ترقی کا انحصار لَا وِالَّا کی حکمت کو صحیح طور پر سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں ہے:

نہادِ زندگی میں ابتدا لَا انتہا اِلَّا
پیامِ موت ہے جب لَا ہوا اِلَّا سے بیگانہ!
وہ ملت روح جس کی لَا سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا لب ریز اُس ملت کا پیمانہ! (ضربِ کلیم)

علامہ ابن دقیق العیدؒ

۶۲۵ھ ـــــ ۷۰۲ھ

تحریر: عبدالرشید عراقی

علامہ ابن دقیق العید، جن کا نام ابوالفتح تقی الدین محمد بن علی تھا، اپنے دَور کے بلند پایہ محدث تھے۔ تمام علومِ اسلامیہ پر اُن کو یکساں عبور حاصل تھا، مگر ان کا خاص فن فقہ و حدیث تھا۔ تمام اربابِ سیر اور تذکرہ نگاروں نے ان کے جامع الکمالات ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ فقہ میں ان کو بہت زیادہ عبور تھا۔ فقہ مالکی کی کامل تحقیق کے بعد فقہ شافعی سے واقفیت حاصل کی اور دونوں کے ''مجمع البحرین'' بنے۔ قاضی ابن فرحون لکھتے ہیں:

> ''علوم میں یگانۂ زمانہ تھے، لوگوں کے دل میں ان کی عزت بھی تھی۔ مذہب مالکی کی مہارت کے بعد مذہب شافعی میں تبحر حاصل کیا اور دونوں مذاہب کے مطابق فتویٰ دیتے۔ حدیث، اصول، علومِ عربیہ اور تمام فنون میں یدطولیٰ حاصل تھا''۔[۱]

اربابِ سیر نے ان کے علمی تبحر کے پیش نظر ان کے جامع الکمالات ہونے کا اعتراف کیا ہے اور ان کو الشیخ الامام، شیخ الاسلام اور المجتہد المطلق جیسے القاب سے یاد کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

انتھت الیه ریاسة العلم فی زمانه[۲]

''اپنے زمانہ میں اپنے علمی تبحر کی وجہ سے ان کا کوئی مدمقابل نہ تھا''۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بستان المحدثین میں لکھتے ہیں:

''امام ہر دو مذہب بود مالکی و شافعی''[۳]

(فقہ مالکی اور شافعی دونوں کے امام تھے۔)

محی السنہ نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں:

''علامہ ابن دقیق العید امام متقن' محدث' فقیہہ' محقق' اصولی' ادیب' شاعر' نحوی' مجتہد اور وافر العقل تھے''۔(۴)

ولادت

محی السنہ نواب صدیق حسن خاں نے ان کا یومِ ولادت ۲۵ رشعبان ۶۲۵ھ بتایا ہے۔ان کی ولادت ساحل ینبوع کے قریب ہوئی جبکہ ان کے والد علی بن ابی الحسن علی اپنے اہل خانہ کے ہمراہ حج کے لئے جا رہے تھے۔(۵)

علامہ ابن السبکی طبقات الشافعیہ الکبریٰ میں لکھتے ہیں کہ ان کے والد نے ان کو گود میں لے کر طواف کیا اور یہ دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس بچے کو عالم باعمل بنائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی اور دنیا نے ان کے علم وعمل کا اعتراف کیا۔(۶)

اساتذہ

علامہ ابن دقیق العید نے اپنے دَور کے مشاہیر علمائے اسلام اور محدثین عظام سے استفادہ کیا۔ابن فرحون لکھتے ہیں:

''ابن دقیق العید نے بہت سے محدثین کرام سے اکتسابِ فیض کیا' اس سلسلہ میں حجاز اور شام کا سفر کیا اور دِمشق میں کثیر علماء سے استفادہ کیا''۔(۷)

امام زکی الدین عبدالعظیم منذری اور شیخ الاسلام عز الدین بن عبدالسلام آپ کے اساتذہ میں شامل ہیں۔حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں:

''تحقیق مذہب مالکی از پدر خود نمودہ و مذہب شافعی را از شیخ عز الدین بن عبد السلام اخذ کردہ' در فقہ ہر دو استاد کامل گشتہ''(۸)

(مالکی مذہب کی تحقیق اپنے والد ماجد سے کی تھی اور مذہب شافعی کو شیخ عز الدین بن عبدالسلام سے حاصل کیا تھا۔چنانچہ فقہ میں ہر دو مذاہب کے استادِ کامل ہوئے۔)

درس وتدریس

فراغت تعلیم کے بعد علامہ ابن دقیق العید نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور درس وتدریس میں اتنی مہارت حاصل کی کہ ان کا شمار اپنے دَور کے ممتاز مدرسین

میں ہونے لگا۔ آپ نے اس دَور کے مشہور دینی مدارس میں تدریس فرمائی۔ حافظ ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ'' میں' حافظ ابن حجر نے ''الدررالکامنہ'' میں' علامہ سیوطی نے ''حسن المحاضرہ'' میں' شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب ''الانصاف'' میں اور علامہ شبلی نعمانی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

''علامہ ابن دقیق العید نے اپنے دَور کے مشہور دینی مدارس میں تدریس کی خدمات انجام دیں اور ان کا شمار ممتاز مدرسین میں ہوتا تھا''۔

افتاء وقضا

علامہ ابن دقیق العید کے علمی تبحر اور ان کے جامع الکمالات ہونے کے پیشِ نظر حکومتِ وقت نے ان کو عہدۂ قضا پیش کیا۔ آپ نے بڑی مشکل سے یہ عہدہ قبول کیا۔ حافظ السبکی لکھتے ہیں:

وولّی قضاء القضاة علی مذهب الشافعي بعد اباء شديد وعزل نفسه غير مرة ثم يعاد(۹)

''شدید انکار کے بعد مذہب شافعی کے قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کیا' پھر بھی انہوں نے کئی بار علیحدگی اختیار کی' مگر ہر بار اُس عہدے پر لوٹائے گئے''۔

اخلاق وفضائل

اخلاق و عادات کے اعتبار سے علامہ ابن دقیق العید اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ بہت کم سخن تھے۔ علامہ السبکی نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''میں نے کبھی کوئی بات ایسی نہیں کی اور نہ کوئی ایسا کام کیا جس کی صفائی اللہ تعالیٰ کے سامنے نہ دے سکوں''۔(۱۰)

حق گوئی اور بے باکی میں ضرب المثل تھے اور ان کی زندگی کے بعض گوشے ان کے استاد شیخ الاسلام عز الدین بن عبدالسلام کے مشابہ تھے۔ عبادت و ریاضت میں بہت آگے تھے۔ رات کا ایک بڑا حصہ تلاوتِ قرآن مجید' تہجد اور ذکر وفکر میں بسر ہوتا تھا۔ مطالعہ کا بہت عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ دنیاوی حب و جاہ کے طالب نہ تھے۔ اہل دنیا سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ علم اور اہل علم کے سوا ان کی نگاہ میں اور کسی کی قدر نہ تھی۔

زہد وورع کا نمونہ تھے۔ شعر وسخن کا عمدہ ذوق رکھتے تھے' خود بھی شعر کہتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے بستان المحدثین میں ان کے کئی اشعار نقل کئے ہیں۔ علامہ ابن دقیق العید صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ عرفان بھی تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں:

''واز طریقہ تصوف بہرہ وافر داشت وصاحب کرامات وخوارق بود''(۱۱)

(طریقِ تصوف میں بھی کمال حاصل تھا اور صاحبِ کرامات وخوارقِ عادات تھے۔)

معاصرین

علامہ ابن دقیق العید کے معاصرین میں سب سے مشہور شخصیت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

''علامہ ابن دقیق العیدؒ سے حافظ ابن تیمیہؒ نے ملاقات کی تو انہوں نے ابن تیمیہ کے علوم کے پیش نظر کہا: میں نہیں سمجھتا کہ آپ سا کوئی اور پیدا ہوگا''۔(۱۲)

علامہ ابن دقیق العید شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے علم وفضل اور ان کے جامع الکمالات ہونے کے معترف تھے۔ پروفیسر ابوزہرہ مصری حیات ابن تیمیہ میں لکھتے ہیں:

''ہم ابن تیمیہ کے معاصرین میں سے چار کی آراء لکھتے ہیں جن میں بعض تو سن وسبقت کے لحاظ سے ان کے شیخ کے درجہ میں تھے' جیسے ابن دقیق العید (م ۷۰۲ھ) انہوں نے ۷۰۰ھ میں کہا تھا کہ (ابن تیمیہ) حافظ حدیث ہیں۔ لوگوں نے کہا پھر آپ نے ان سے کیوں نہ گفتگو کی؟ کہنے لگے وہ باتیں کرنا پسند کرتے ہیں اور مجھے خاموشی پسند ہے۔ میں جب ابن تیمیہؒ سے ملا تو دیکھا کہ وہ ایسے آدمی ہیں کہ سارے علوم ان کی نگاہ کے سامنے ہیں' جو چاہتے ہیں لے لیتے ہیں اور جو چاہتے ہیں چھوڑ دیتے ہیں''۔(۱۳)

وفات

علامہ ابن دقیق العید نے ۱۱ر صفر ۷۰۲ھ بروز جمعہ انتقال کیا۔(۱۴)

تصانیف

علامہ ابن دقیق العید صاحبِ تصانیفِ کثیرہ تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث

دہلوی لکھتے ہیں:

''اکثر در شغل علم شب بیداری کردو بسیاری نوشت''(۱۵)

(علم کے شغل میں اکثر شب بیداری کرتے اور بہت لکھا کرتے تھے۔)

ان کی اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

(۱) الالمام فی احادیث الاحکام

(۲) الامام فی شرح الالمام

(۳) احکام الاحکام فی شرح احادیث سید الانام

(٤) شرح مختصر ابن حاجب

(٥) کتاب فی اصول الدین

(٦) علو م الحدیث

(۷) اربعین فی روایة عن رب العالمین(۱٦)

حواشی

۱) الدیباج المذہب' ص۳۲۴

۲) البدایہ والنہایہ' ج۱۴' ص۲۷

۳) بستان المحدثین' ص۱۲۹

۴) اتحاف النبلاء' ص۳۵۹

۵) اتحاف النبلاء' ص۳۵۹

٦) طبقات الشافعیہ الکبریٰ' ج۱' ص۵

۷) الدیباج المذہب' ص۳۲۴

۸) بستان المحدثین' ص۱۴۲

۹) طبقات الشافعیہ الکبریٰ' ج۱' ص۵

۱۰) طبقات الشافعیہ الکبریٰ' ج۱' ص۵

۱۱) بستان المحدثین' ص۱۴۲

۱۲) البدایہ والنہایہ' ج۱۴' ص۲۷

۱۳) حیات ابن تیمیہ' ص۹۴

۱۴) البدایہ والنہایہ' ج۱۴' ص۲۷

۱۵) بستان المحدثین' ص۱۴۲

۱٦) بستان المحدثین' ص۱۴۲

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

تعارف وتبصرۂ کتب

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : القرآن الکریم (مع ترجمہ وحواشی)

ضخامت: 800 صفحات' سائز صفحہ: 8/ 23x36' ہدیہ: 300 روپے

شائع کردہ: ادارہ علم القرآن' بوتل بازار شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ملنے کا پتہ: صفہ پبلشرز' 19۔اے' ایبٹ روڈ لاہور

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ پر نازل ہونے والی آخری آسمانی کتاب ہے جو قیامت تک کے لئے بنی نوع انسان کی رہنمائی اور رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ یہ ایک آفاقی پیغام ہے جس نے انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب برپا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے خود اسے ھُدًی للنَّاس قرار دیا۔ مسلمانوں پر قرآن مجید کے بہت سے حقوق واجب الادا ہیں' مثلاً اس کو پڑھنا' اس کو سمجھنا' اس پر غور و فکر کرنا' اس پر عمل کرنا اور پھر اس آفاقی پیغامِ رشد و ہدایت کو دوسروں تک پہنچانا' تاکہ اللہ کا دین پوری دنیا میں پھیل جائے اور اسلام کا غلبہ ہو۔ یہی منشائے الٰہی ہے۔ اس کو سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کے لئے دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کئے گئے۔ قرآن فہمی کی اہمیت کے پیشِ نظر پچاس سے زیادہ زبانوں میں اس کے تراجم و تفاسیر موجود ہیں۔ برعظیم پاک و ہند میں بھی علمائے کرام اور مفسرین عِظام نے اپنے اپنے زمانے میں اس کے تراجم و تفاسیر کے باب میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ بعض علماء نے آزاد ترجمانی کا اسلوب اختیار کیا تو بعض نے محض عربی الفاظ کا اردو متبادل مہیا کرنے پر اکتفا کیا اور مفہوم اخذ کرنے اور معانی کی گہرائی تک پہنچنے کی ذمہ داری قاری

پر چھوڑ دی۔

اس بابرکت سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے ادارہ علم القرآن کے زیر اہتمام اہلِ علم کی ایک جماعت نے متن قرآن کو سامنے رکھ کر قرآن حکیم کے تراجم سے استفادہ کرتے ہوئے ایک نیا ترجمہ ترتیب دیا ہے۔ یہ ترجمہ نہ تو مکمل طور پر پابند ترجمہ ہے اور نہ ہی مکمل طور پر آزاد۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ ہر لفظ کا ترجمہ اس لفظ کی ترتیب کے مطابق آئے اور اس سے جملے کا مفہوم بھی واضح ہو جائے۔ زیر تبصرہ نسخہ اس اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا ہے کہ اس کے متن اور ترجمہ میں دو رنگ (نیلا اور سرخ) استعمال کئے گئے ہیں اور ہر آیت میں موجود الفاظ کا ترجمہ اسی رنگ میں سامنے دیا گیا ہے۔ اردو کے آسان اور عام مستعمل الفاظ کے ساتھ ساتھ جملے کی سادگی، سلاست اور عام فہمی کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے تاکہ عام قاری کو اس کے سمجھنے میں دقت نہ ہو۔

ترجمہ پر نظر ثانی اور اس کو حتمی صورت ڈاکٹر محمود الحسن عارف نے دی ہے جو ایک مستند عالم دین اور بادشاہی مسجد لاہور کے اعزازی خطیب ہیں۔ ترجمہ کو زیادہ مفید بنانے کے لئے حواشی میں مختصر تشریحات اور ہر پارہ کے شروع میں اس کے مضامین کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ عام قاری کی معلومات میں اضافہ کے لئے مختلف ضمیمہ جات دیئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے قرآن حکیم کے متعلق بصیرت میں یقینی طور پر اضافہ ہوگا۔

بڑے سائز کے ۸۰۰ صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ قرآن پر کشش دیدہ زیب انداز میں مضبوط جلد اور مناسب ہدیہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ تاہم اس میں چند لفظی غلطیاں موجود ہیں، مثلاً صفحہ ۲۲۵ پر و اعلموا کی جگہ و علموا، صفحہ ۸۳ پر لن تنالوا البر کی جگہ لن تنال البر اور صفحہ ۷۰۸ میں بنی النضیر کو بنی النصیر لکھا گیا ہے۔ امید ہے اگلے ایڈیشن میں یہ لفظی غلطیاں بھی دور ہو جائیں گی۔

بہرحال قرآن مجید سمجھ کر پڑھنے والوں کے لئے ایک یہ مفید نسخہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ادارے کی اس کوشش کو کامیاب فرمائے اور اس ترجمہ قرآن کریم کو لوگوں کے لئے فہم دین کا ذریعہ بنائے۔"

(۲)

نام کتاب : اسلام اور عصرِ حاضر کے مسائل وحل

مرتب : پروفیسر عبدالماجد

ضخامت:270 صفحات ' قیمت:100 روپے

ملنے کا پتہ:HSSRD آفس ہمالہ اکیڈمی' اکبر خان روڈ' مانسہرہ

پروفیسر عبدالماجد معروف اہلِ علم و دانش ہیں۔ اس سے پہلے ان کی ایک کتاب اسلام اور جدید سائنس شائع ہو چکی ہے۔ ۱۹۸۶ء تا ۲۰۰۲ء کے دوران منعقد ہونے والے مقابلہ مقالات نگاری پر سیرت کانفرنس کے موقع پر انہیں پانچ صدارتی انعامات کا مستحق قرار دیا گیا۔ متحدہ علماء کونسل اسلام آباد کی طرف سے مصنف کو ۱۹۹۲ء کے کل پاکستان مقابلہ مضمون نویسی میں پہلا انعام دیا گیا۔ اس کے علاوہ مصنف نے بیرون ملک سے بھی مقالہ نگاری میں ایوارڈ حاصل کیا۔

زیرِ تبصرہ کتاب مصنف کے چودہ مقالات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ایک مضمون شیخ الاسلام قاری محمد طیب اور ایک مضمون باوا عبدالرحیم محی الدین کا ہے۔ تمام مضامین انتہائی معیاری' مفید' فکر انگیز اور معلومات افزا ہیں۔ بعض مضامین خاصے طویل اور بعض مختصر ہیں۔ مصنف کے الفاظ میں ان مضامین کا بنیادی تانا بانا اس خیال پر مبنی ہے کہ انسان کے موجودہ مسائل اور مصائب کو کس طرح وحی الٰہی کی روشنی میں حل کیا جا سکتا ہے۔

ہر مضمون کے مندرجات کو ثقہ حوالوں کے ساتھ مضبوط کیا گیا ہے۔ تمام مضامین بلند پایہ اور حقائق پر مبنی ہیں' کہیں بھی مصنف کا قلم اعتدال کی راہ سے ہٹنے نہیں پایا۔ یوں تو سارے مضمون ہی وقیع ہیں تاہم ''عدم برداشت کا قومی اور بین الاقوامی رجحان اور تعلیمات نبوی'' نہایت جامع اور ہمہ گیر ہے۔ کتاب سے مذہبی سکالر بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی۔

کتاب مضبوط جلد اور خوبصورت ٹائٹل سے مزین ہے۔ کتاب کے آخر میں مصنف کا مختصر تعارف بھی دیا گیا ہے۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام قرآن اکیڈمی کے

ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس

میں داخلے کے لئے طالبانِ قرآن سے درخواستیں مطلوب ہیں:

☆ واضح رہے کہ یہ کورس بنیادی طور پر گریجوایٹس اور پوسٹ گریجوایٹس کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔ پیش نظر یہ ہے کہ وہ حضرات جو کم از کم گریجوایشن کی سطح تک اپنی دنیاوی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور اب بنیادی دینی تعلیم بالخصوص عربی زبان سیکھ کر فہم قرآن کے حصول کے خواہش مند ہوں' انہیں اس کورس کے ذریعے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی جائے ـــــ تاہم بعض استثنائی صورتوں میں ایف اے کی بنیاد پر بھی اس کورس میں داخلہ لیا جا سکتا ہے۔

نصاب

۱) عربی گرامر
۲) عربی ریڈر
۳) مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب
۴) تذکیر بالقرآن (دورۂ ترجمۂ قرآن)
۵) تجوید و حفظ
۶) ترکیب قرآن مع عربی گرامر
۷) علومِ حدیث اور مطالعۂ حدیث
۸) اضافی محاضرات

☆ کورس کا آغاز ان شاء اللہ یکم ستمبر سے ہوگا اور کورس کا دورانیہ نو ماہ ہوگا۔

کورس کا تفصیلی پراسپکٹس

جس میں داخلے سے متعلق ضروری معلومات کے علاوہ کورس میں شامل مضامین کی تفصیل' طریق تدریس اور نظام الاوقات کی وضاحت بھی شامل ہے' درج ذیل پتے سے حاصل کریں:

ناظم برائے ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس
36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور (فون: 03-5869501)